آکاش بیل
علیم الحق حقی

آکاش بیل

زندگی ایک اسٹیج ہے۔ ہرانسان اس اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنا کردار بھول کر دوسرے کردار میں یوں ڈھل جاتے ہیں کہ قریب رہنے والوں کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جسے اپنے لئے بے حد مشکل مگر موزوں کردار مل گیا تھا............ اس نے اداکاری کا حق ادا کر دیا۔

وہ منظر حقیقی نہیں.......... لینڈ اسکیپ کی کسی پینٹنگ کا حصہ لگ رہا تھا۔ مجھے تو ایسا لگا' جیسے میں خود بھی اس پینٹنگ میں موجود کوئی فِگر ہوں۔ سر پر چمک دار نیلگوں آسمان کی چادر تھی۔ بادل یوں ٹھہرے ہوئے تھے' جیسے کسی نے انہیں زمین اور آسمان کے درمیان ٹانک دیا ہو۔ سامنے نیلگوں پہاڑیاں تھیں' جنہوں نے آسمان کا رنگ اوڑھ لیا تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں سبز مخملیں چراگاہیں تھیں۔ ایک طرف جھیل کا آئینہ خانہ تھا' جو بڑی دیانت داری سے ہر رنگ کو منعکس کر رہا تھا۔

مجھے وہ سب کچھ بے حد اپنا اپنا سا لگا۔ وہاں میرے اور دو سوتی ہوئی بھیڑوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں اس وقت خود کو رُوئے زمین کی واحد اور پہلی عورت سمجھ رہی تھی' جو دھوپ میں بیٹھی اپنے آدم کے تصور میں کھوئی ہوئی ہو۔ کیسا بے کراں سکون تھا۔

"روشنا!" عقب سے.......... بے حد قریب سے کسی نے پکارا۔

میں چونکی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرا آدم نہیں تھا۔ وہ تو کوئی سخت گیر طبیعت کا جوان آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر ایک نظر میں احساس ہو گیا کہ وہ طبعاً لڑاکا آدمی ہے۔ لڑنے کے لئے بہانے تلاش کرتا ہو گا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی اور انداز میں بلا کی خود اعتمادی۔ اُس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی۔

"اوہ..........تو تم آ گئیں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے پہلے ہی خدشہ تھا۔ یہ تمہی ہو۔ بڑے میاں نے کبھی یہ بات تسلیم نہیں کی کہ تم حادثے میں مر چکی ہو۔ وہ کہتے تھے' تم ایک نہ ایک دن واپس آؤ گی.......... اور بخدا' وہ سچ کہتے تھے لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آیا۔ اب بھی میں اس مشابہت کو نظروں کا دھوکا سمجھ رہا تھا۔"

اس کی آواز نرم اور لہجہ شیریں تھا مگر اس نرمی اور شیرینی کی تہہ میں کوئی چیز تھی' جسے میں سمجھ نہیں سکی۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے کتے نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی تھی۔ اس کے کان پہلوؤں سے چپک گئے اور کمر کے بال کھڑے ہو گئے۔

میں اردگرد پھیلے ہوئے پتھروں کی طرح ساکت و صامت رہی۔ مجھے احساس تھا کہ

حیرت سے میرا منہ کھل گیا ہے۔ آنکھوں سے بھی یقیناً حیرت جھانک رہی ہو گی۔

"یہ بتاؤ' تم واپس کس لئے آئی ہو۔ کیا ارادہ ہے؟ اگر یہاں سے سیدھا گھر جانے کا ارادہ ہے تو خوب سوچ سمجھ لو۔ اس لئے کہ تمہارا واسطہ اب دادا سے نہیں' مجھ سے پڑے گا۔ اب میں ہی فارم کا مالک ہوں اور یہ بھی بتا دوں کہ فارم کا مالک میں ہی رہوں گا۔" وہ اپنی دھن میں کہتا رہا۔

بڑی کوشش کے بعد میرے حلق سے بھنچی بھنچی سی آواز نکلی۔ "میں.......... میں سمجھی نہیں۔"

"میں نے اڈے پر تمہیں بس سے اترتے دیکھا۔ میں خاموشی سے تمہارا تعاقب کرتا رہا۔ تمہیں راستے میں روکنا مناسب نہیں تھا۔ میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔"

اب اس کی آواز میں عجیب سی تندی در آئی تھی۔ مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ "تم غلطی پر ہو۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں.........." میری آواز بلا ارادہ بلند ہو گئی۔

"غلطی؟ غلط فہمی؟ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔" وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کے تیور بے حد خراب تھے۔ "ویسے تمہارے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ اتنے برسوں کے بعد کتنے مزے سے چلی آئی ہو' اور وہ بھی دن دیہاڑے! یاد ہے' اُس رات تم اور میں یہیں' دریا کے کنارے کگر پر چل رہے تھے۔ آج بھی تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے اس طرح چلا آؤں گا۔ تو تم یوں تنہا اس طرف کا رُخ نہ کرتیں۔"

اس بار میں خوف زدہ ہوئی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ایک قدم اور بڑھ آیا۔ دیوانگی کے اس لمحے میں' میں نے سوچا کہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوں لیکن اوپر عمودی چٹانیں تھیں اور سامنے ناہموار راستہ جو بھاگنے والے کو دریا میں پہنچاتا اور دریا کا بہاؤ اتنا تند تھا کہ اکھڑنے ہوئے درخت بہا لے جائے۔ میری حقیقت ہی کیا تھی اور پھر کتا بھی تھا۔

"تم فارم کی طرف بھی گئی تھیں؟"

مجھے احساس ہو گیا کہ یہ سوال اور اس کا جواب بے حد اہم ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں' تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے تو تم کوئی خطرناک پاگل معلوم ہوتے ہو۔ اتنی بے تکلفی سے یکطرفہ گفتگو کئے جا رہے ہو جبکہ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں تمہیں جانتی بھی نہیں۔"

ایک لمحے کو وہ ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں کشادہ ہوئیں اور ان سے بے یقینی

جھانکنے لگی۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔

مجھے اب اُس کی کیفیت سے مزید فائدہ اٹھانا تھا۔ اس بار میرا لہجہ سخت تھا۔ شاید اس کی وجہ میری خوف زدگی تھی۔ "اب تم میرا پیچھا چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ساکت کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ "تم یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ مجھے نہیں جانتیں۔ حالانکہ میں تمہارا رشتے کا بھائی ہوں۔"

"میں کہہ رہی ہوں کہ میں نے زندگی میں آج پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔ تم خواہ مخواہ گلے پڑ رہے ہو۔ اب میرا پیچھا چھوڑ دو۔ خدا حافظ۔" میں نے کہا اور پلٹ کر چل دی۔

"میری بات سنو۔ مجھے واقعی غلط فہمی ہوئی تھی۔ میں شرمندہ ہوں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے سے سخت گیری کی برف پگھل رہی تھی۔ اب وہ ایک خوش رو آدمی لگ رہا تھا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ مشابہت بہت زیادہ تھی۔"

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہ تو میں بھی سمجھ گئی ہوں۔"

"مجھ سے ناراض نہ ہو کہیں نہ کہیں فرق ہو گا مگر میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم وہی ہو........." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ لگتا تھا' اُسے زبردست شاک لگا ہے۔

"اگر تم چاہو تو میں بھی قسم کھا سکتی ہوں۔" میرا لہجہ بہ دستور خشک تھا۔ "میرا نام روشنا نہیں' ثمینہ ہے۔ میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے یہ علاقہ خواب میں بھی نہیں دیکھا۔"

وہ پہلی بار مسکرایا۔ "میں نے خواہ مخواہ تمہیں ڈرا دیا۔ ویسے یہ تو تم سمجھ گئی ہو گی کہ میں اسے ڈرانا چاہتا تھا۔"

"ظاہر ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ تم نے میری دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہو گا۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ویسے میرے انداز سے تمہیں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔"

"میں پوری طرح معاملات سے واقف نہیں ہوں' اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ یہ چٹانی چھجا بہت اونچا ہے اور سڑک بہت دور۔ تم کچھ بھی کر سکتے تھے۔"

"اوہ.........." اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا کیونکہ میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ خوبرو شخص پانچ منٹ پہلے میرے قتل کے درپے تھا۔ البتہ اب ایسی بات نہیں تھی۔ "تم نے مجھے معاف کر دیا ہے تو اب جا کیوں رہی ہو۔ اچھی خاصی لطف اندوز ہو رہی تھیں.........."

مجھے چاہیے تھا کہ اُسے نظرانداز کر کے چل دیتی۔ مگر اب خوف دور ہو چکا تھا اور تجسس حاوی آگیا تھا۔ یہ تصور عجیب سا تھا دنیا میں میرا کوئی ہم شکل بھی موجود ہے۔

"تم کہیں قریب ہی ٹھہری ہوئی ہو۔ لیکن نہیں' ایسا ہوتا تو اب تک چرچا ہو چکا ہوتا تمہارا۔ تمہاری صورت اس علاقے میں جانی پہچانی ہے۔" اس نے خود سوال کیا' خود ہی جواب دے دیا۔ پھر پوچھا۔ "تفریح کی غرض سے آئی ہو؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر چہرے پر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمہیں شاید ابھی تک یقین نہیں آیا۔"

"یہ بات نہیں۔ مجھے یقین آگیا ہے۔ اب یہ فطری بات ہے کہ میں تمہیں توجہ سے دیکھ رہا ہوں۔ دیکھونا.......... کسی کا ہم شکل روز روز تو نہیں ملتا۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ ویسے روشنا تو مرچکی ہے۔"

مجھے شاک لگا۔ روشنا کی موت کا ذکر کرتے وقت اس کے لہجے میں دُکھ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہ بہت غیر فطری بات تھی۔ آخر روشنا اس کی رشتے کی بہن تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "اگر تم اسے ناپسند کرتے تھے تو مجھے دیکھنا تمہارے لیے خوش گوار تو نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہاری رشتے کی بہن تھی نا؟"

"ہاں۔ اور میری اس سے شادی ہونے والی تھی۔"

حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ "واقعی؟" میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔

"لیکن وہ شادی سے پہلے ہی بھاگ گئی۔ یہ آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ پھر اس نے اپنے دادا کو خط لکھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ یہ درست ہے کہ اس سے میرا جھگڑا ہوا تھا.......... خیر.......... وہ چلی گئی۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ مرد ایسی باتوں کو کبھی نہیں بھولتے اور پھر ہم پہاڑی مرد۔ مجھے آج تک توہین کا احساس ستاتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ تم تو کوئی معمولی بات بھی نہیں بھول سکتے۔ تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ تم نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا ہو گا۔ میں نے کہا۔ "آٹھ

سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ اتنے عرصے میں تو گہرے سے گہرا زخم مندمل ہو جاتا ہے اور پھر تم نے شادی کرلی ہو گی۔ شادی کے بعد تو ایسی رنجشیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔"

"نہیں۔ میں نے شادی نہیں کی اب تک۔"

"کیا!" میری حیرت اپنی جگہ درست تھی۔ اس کی عمر تیس سال سے کم نہیں تھی۔ پہاڑی علاقوں کے لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ "میری سوتیلی بہن کلثوم گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔" اس نے کہا۔ پھر فخریہ لہجے میں بولا۔ "ہمارا فارم بہت بڑا ہے اور بہت پرانا۔ تمہیں فارم کی زندگی کا تجربہ ہے؟"

میں نے نفی میں سرہلا دیا۔

"گھڑسواری کا شوق ہے تمہیں؟ گھوڑوں سے دلچسپی ہے؟"

سوال اس قدر اچانک اور غیر متعلق تھا کہ میں ششدر رہ گئی۔ "گھوڑوں سے! نہیں بھئی' سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ کیوں پوچھا تم نے؟"

"روشنا گھوڑوں کے معاملے میں جادوگرنی تھی۔ وہ ان سے سرگوشی میں باتیں کرتی اور گھوڑے اس کے اشاروں پر ناچتے۔"

"مجھے گھوڑوں سے ذرا دلچسپی نہیں اور یہ تم اب تک مجھے گھورے کیوں جا رہے ہو؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے لیکن میں کیا کروں۔ مشابہت اتنی زیادہ ہے کہ..........اور روشنا یہاں سے گئی تو 19 سال کی تھی۔"

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ "ہاں.......... 19 جمع 8' 27 ہوتے ہیں۔ چلو' میں نے مان لیا کہ میری عمر 27 سال ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا لہجہ خاصا صاف ہے مگر پھر بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم روشنا نہیں ہو۔ تمہارے لہجے میں اس علاقے کے لہجے کی جھلکیاں بھی ہیں۔"

"میرے دادا خان پورے ہی کے تھے۔ مگر میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ میں کراچی ہی میں پیدا ہوئی تھی۔"

"مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ یہ مشابہت بے سبب نہیں ہو سکتی۔ تمہارے ہمارے درمیان یقیناً خون کا رشتہ ہو گا۔"

"گاؤں کا نام مجھے نہیں معلوم۔ بس میرے دادا یہ بتاتے تھے کہ خان پورے میں اُن کی زمینیں تھیں .... بارانی۔ پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر چلے آئے۔"

"تو اب تم یہاں کیوں آئی ہو؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

مجھے غصہ آنے لگا۔ "میرے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ دادا اُن سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ اسے جنت نظیر علاقہ کہتے تھے۔ مجھے بڑی آرزو تھی یہ علاقہ دیکھنے کی۔ میں شہر میں ملازمت کرتی ہوں۔ میں نے تفریحی سفر کے لیے کچھ رقم بچائی اور چھٹی لے کر یہاں آ گئی اور یہاں کوئی کیوں آئے گا؟"

"تمہاری جڑیں یہاں ہیں۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "مجھے یقین ہے، تم کسی نہ کسی طور بوڑھے زریاب خان کی رشتے دار ہو۔ اس اعتبار سے میں تمہارا رشتے کا بھائی ہوں۔ تمہارے نقوش، تمہارا ہر انداز گواہی دیتا ہے کہ تم انہی پہاڑوں کی بیٹی ہو۔ تمہارے حسن میں بھی پہاڑوں کا سا وقار ہے، روشنا کی طرح۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا تو روشنا کو دیکھ کر میری سانسیں رُک گئیں۔ وہ بے حد حسین تھی۔"

میں نے اپنی مجوبیت چھپانے کی کوشش کی۔ "چلو، میں تو زریاب خان کی رشتے دار ہوں بقول تمہارے۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ نا۔ تم کون ہو؟"

"میں زریاب خان کا دور کا رشتے دار ہوں لیکن میں نے اس کی بڑی خدمت کی ہے۔ فارم پر بڑی محنت کی ہے میں نے۔ آدم نورزئی نے بہت کوشش کی کہ ہماری زمینیں خرید لے مگر میں نے دم توڑتے ہوئے فارم کو پھر سے زندہ کر دیا۔ اب آدم جا چکا ہے جبکہ ہم اپنی جگہ موجود ہیں۔ اس کی حویلی جل کر خاک ہو چکی۔"

"کیسے؟ کیا ہوا تھا؟ جانی نقصان بھی ہوا ہو گا؟" میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ جانی نقصان نہیں ہوا۔ سب لوگ بچا لیے گئے۔ آگ آدم کی بیوی زاریہ خانم کے کمرے سے شروع ہوئی۔ دو تین بجے کا وقت ہو گا۔ شمع دان گر جانے کی وجہ سے آگ لگی تھی۔ آدم جس وقت بیوی کے کمرے میں پہنچا تو اس کا بستر پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ آدم نے بڑی مشکل سے اسے گھسیٹ کر نکالا۔ وہ بے ہوش تھی۔ آدم اسے کمبل میں لپیٹ کر باہر نکال لایا۔ بعد میں بڑی افواہیں پھیلیں۔ میاں بیوی کے تعلقات پہلے ہی سے کشیدہ تھے۔ آدم اچھا آدمی تھا۔ سب اُسے پسند کرتے تھے لیکن یہ خیال عام تھا کہ اس نے دولت کے لالچ میں زاریہ خانم سے شادی کی تھی۔ اگر یہ درست بھی ہے، تب بھی آدم کو اس کے قصور کی سزا مل گئی۔ اسے دولت بھی نہیں ملی۔ سب

کچھ تو جل کر خاک ہو گیا تھا۔ رہا سہا زاریہ کے علاج کی نذر ہو گیا۔ ابھی دو سال پہلے زاریہ کا انتقال ہوا ہے۔ اس کے بعد آدم واپس آیا۔ اس نے حویلی کی زمین فروخت کی۔ مگر اسے کچھ بھی نہیں ملا۔ زمین بیچ کر اس نے قرض اتارا۔"

"تو آدم واپس آ گیا؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"آ گیا تھا لیکن زمین بیچ کر خان پور شہر واپس چلا گیا۔ ہے نا ڈرامائی کہانی؟" اس نے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ "تم میری بات توجہ سے نہیں سن رہی ہو!"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اب میں چلتی ہوں۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" میں نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ جلدی کی کیا بات ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ یہ بتاؤ، تمہاری ملازمت کیسی ہے؟ کتنی تنخواہ ملتی ہے تمہیں؟"

"تم تو یوں پوچھ رہے ہو، جیسے مجھے ملازمت کی پیشکش کرنے کا ارادہ ہو؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ ناممکن تو نہیں۔ آخر ہم دور کے رشتے دار ہیں۔ مجھے تو تمہارا خیال رکھنا ہی ہے۔" پھر وہ ہنس دیا۔

"ممکن ہے، ہم دور پرے کے رشتے دار ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری تنخواہ زیادہ نہیں لیکن میں تمہاری پیشکش قبول نہیں کر سکتی۔ اچھا .... خدا حافظ۔"

"خدا حافظ ثمینہ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا۔" خلافِ توقع اس نے اصرار نہیں کیا۔ میں اونچے نیچے راستے پر قدم بڑھاتی رہی۔ مجھے اپنی پشت پر اس کی نظریں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆======☆======☆

لیکن جہانگیر سے میری وہ ملاقات آخری ثابت نہ ہو سکی۔ اگلے روز میں رخصت ہونے کی غرض سے سامان پیک کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے سوچا، شاید ہوٹل کا ملازم ہو گا اور کھانے کے لئے پوچھنے آیا ہو گا۔ "اندر آ جاؤ۔" میں نے پکارا۔ جواب میں ایک اور دستک سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک عورت کھڑی تھی۔

"تم ثمینہ ہو؟" اس نے پوچھا۔ لب و لہجہ مقامی لوگوں کا سا تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے اسے بغور دیکھا لیکن میں اسے پہچان نہ سکی۔ "فرمائیے۔"

"میرا نام کلثوم ہے۔ مجھے جہانگیر نے بھیجا ہے۔ نواب پور میں ہمارا فارم ہے۔ کل

دریا کنارے جہانگیر سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے وضاحت کی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میں اسے نہیں پہچان سکی۔ وہ یقیناً جہانگیر کی سوتیلی بہن تھی۔ مشابہت گواہی دے رہی تھی۔ "ہاں.......... یاد آیا۔ اس شخص نے مجھ سے عجیب گفتگو کی تھی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

کلثوم کرسی پر بیٹھ گئی۔ "جہانگیر نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں آیا لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ جہانگیر کا خیال غلط نہیں تھا۔"

"جس مشابہت کا جہانگیر صاحب نے ذکر کیا تھا' وہ آپ کو بھی محسوس ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ویسے میں نے روشنا کو کبھی نہیں دیکھا۔ میں اس کے جانے کے بعد یہاں آئی تھی لیکن خان بابا کے کمرے میں اس کی بے شمار تصویریں ہیں۔ مشابہت واقعی حیرت انگیز ہے۔"

"تب تو مجھے بھی مان لینا چاہئے۔" میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "ویسے یہ خان بابا' جہانگیر صاحب کے کیا لگتے ہیں؟"

"رشتے کے دادا ہیں۔" کلثوم نے کہا۔ "روشنا کے سگے دادا ہیں۔"

"چلو کلثوم بی بی' میں نے مان لیا کہ میں روشنا کی ہم شکل ہوں۔ پھر؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم لوگوں کی دلچسپی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارے بھائی نے جس انداز میں مجھ سے بات کی' وہ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اب تم مجھ سے ملنے آگئی ہو۔ میں ان عنایات کا مطلب نہیں سمجھ سکی ہوں۔"

"میں ابھی سمجھاتی ہوں۔" کلثوم نے بے حد تحمل سے کہا۔ پھر چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولی۔ "دراصل ہم یہ چاہتے ہیں کہ روشنا واپس آجائے۔"

میں حیران رہ گئی۔ "لیکن روشنا تو مرچکی ہے۔"

کلثوم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ "ہاں.......... وہ مرچکی ہے۔ گویا واپس آکر کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرسکتی۔ تمہیں کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں۔"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا مگر وہ بے تاثر تھیں۔ "تم مجھے روشنا کی حیثیت سے نواب پور لے جانا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ "تم ٹھیک سمجھی ہو۔ یہی بات ہے۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ اس کا سبب کچھ تو اعصابی کشیدگی تھی اور کچھ یہ کہ اس کی تجویز

مجھے مسخرا پن محسوس ہوئی تھی۔ "معاف کرنا' ایسا تو صرف فلموں اور کہانیوں میں ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں اس قسم کے فریب کا پردہ چاک ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

"یہاں صورتِ حال مختلف ہے۔ تمہاری آمد سے صرف صغریٰ کو نقصان ہوگا لیکن صغریٰ کو دولت کی کمی نہیں۔ ویسے بھی وہ روشنا سے بہت محبت کرتی تھی۔"

"یہ صغریٰ کون ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ جب روشنا یہاں سے گئی تو صغریٰ بمشکل گیارہ سال کی تھی۔ وہ تم پر شک نہیں کرسکے گی۔ جہاں تک خان بابا کا تعلق ہے تو انہوں نے روشنا کو کبھی مُردہ تسلیم نہیں کیا۔ تمہاری واپسی ان کے لئے ان کے خواب کی تعبیر ہوگی۔ انہیں روشنا سے بے حد محبت تھی۔"

"اِس سے فائدہ کیا ہوگا؟"

وہ گویا میری ناسمجھی پر مسکرائی۔ "جہانگیر نے فارم پر بڑی محنت کی ہے لیکن وہ خان بابا کا وارث نہیں ہے۔"

بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں اٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ جہانگیر فارم پر قابض ہونا چاہتا تھا جبکہ روشنا کے جانے کے بعد صغریٰ' زریاب خان کی وارث قرار پائی ہوگی اور یہ جہانگیر کو گوارا نہیں ہوگا۔ اب وہ میری مدد سے فارم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

کلثوم اب مجھے پس منظر فراہم کر رہی تھی۔ "خان بابا کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کی بیٹی روشنا تھی۔ روشنا چودہ سال کی تھی کہ اس کے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وہ دادا کے پاس رہنے لگی۔ صغریٰ' خان بابا کے چھوٹے بیٹے کی اکلوتی بچی تھی۔ اس کے والدین کا کار کے حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ وہ ایبٹ آباد میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

دونوں بیٹوں کی موت نے خان بابا کی کمر توڑ دی تھی۔ اتنے بڑے فارم اور جاگیر کی نگرانی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اعزا میں اب دور کے رشتے سے ایک پوتا ہی رہ گیا تھا' جو پشاور میں مقیم تھا۔ چنانچہ خان بابا نے جہانگیر کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے فارم کا نگراں بنا دیا۔

جہانگیر کی ماں بیوہ تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی کلثوم۔ انہی دنوں جہانگیر کے باپ سے اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کے ایک سال بعد جہانگیر پیدا ہوا۔ اس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا۔ وہ تیرہ سال کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ماں نے تیسری شادی کرلی اور لاڈ پیار کے عادی جہانگیر کو پوری طرح نظرانداز

کر دیا۔ سوتیلے باپ کا رویہ بہت خراب تھا۔ چنانچہ زریاب خان کا خط ملتے ہی جہانگیر نواب پور کے لئے روانہ ہو گیا۔

جہانگیر نے فارم پر محنت کر کے خود کو ناگزیر ثابت کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ فارم کی محبت میں بھی گرفتار ہو گیا۔ اس نے فارم کے حصول کی خاطر زریاب خان کی بڑی خدمت کی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ فارم اسے نہیں مل سکے گا۔ زریاب خان ضدی آدمی ہے اور اپنی پوتی روشنا سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ روشنا کے جانے پر بھی نہیں بدلا۔ اب بھی اس کا کہنا یہی ہے کہ روشنا زندہ ہے اور اس کی تمام جائیداد کی مالک بھی وہی ہے۔ اب اگر اس کا رویہ بدلا بھی تو وہ صغریٰ کو سب کچھ سونپ دے گا اور یہ زیادتی ہو گی۔"

پھر کلثوم نے یہ بھی بتایا کہ فارم کے بعد جہانگیر' روشنا کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے' یہ منافع کا سودا تھا۔ روشنا کے ساتھ فارم بھی اسے مل جاتا۔ زریاب خان کے لئے یہ بات خوش کن تھی کیونکہ روشنا اُسے محبت اور خون کے رشتے سے عزیز تھی تو جہانگیر محنت کے رشتے سے۔ اس کے نزدیک جہانگیر اس انعام کا مستحق تھا۔

"اب یہ نہیں معلوم کہ ان دونوں کے درمیان کیا گڑبڑ ہوئی۔" کلثوم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جہانگیر کچھ بتاتا ہی نہیں۔ بہرحال دونوں کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا۔ روشنا' جہانگیر کو جلانے کے چکر میں پڑ گئی۔ جہانگیر بچپن ہی سے بہت غصہ ور ہے۔ ایک رات دونوں میں لڑائی ہوئی۔ روشنا نے کہا کہ اب یہاں یا تو وہ رہے گی یا جہانگیر رہے گا۔ پھر اس نے جا کر خان بابا سے بھی یہی کہہ دیا۔ خان بابا بہت مایوس اور ناراض ہوئے۔ انہوں نے روشنا کو سخت سُست کہا۔ روشنا اسی رات چپکے سے گھر سے کہیں چلی گئی۔ خان بابا بھی ضدی ہیں۔ انہوں نے اسے تلاش کرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کوئی ایک ماہ بعد انہیں شہر سے روشنا کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ خیریت سے ہے لیکن اب کبھی گھر واپس نہیں آئے گی۔ اس کے بعد تین سال تک اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اخبار میں ٹرین کے ایک حادثے کی خبر چھپی۔ مرنے والوں میں روشنا فتح یاب کا نام بھی تھا۔ خان بابا نے اس سلسلے میں چھان بین کرائی۔ ثابت ہو گیا کہ وہ ان کی روشنا ہی تھی۔ مگر خان بابا نے کبھی یہ بات تسلیم نہیں کی۔ یہ ہے پوری کہانی۔"

میں کھڑکی سے پلٹ آئی۔ "اب اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"روشنا کے جانے کے بعد جہانگیر کو میرا خیال آیا۔" کلثوم نے سادگی سے کہا۔ "اس

نے خان بابا سے بات کر کے مجھے بھی یہاں بلوا لیا۔"

"اب یہ بتا دو کہ مجھ سے جہانگیر کو کیسے فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں دبے دبے ہیجان کی جھلک نظر آئی۔ "تم دلچسپی لے رہی ہو نا؟ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"مجھے کسی فراڈ میں آلہ کار بننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف کہانی میں دلچسپی ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔ "میں ایسی احمقانہ اسکیم میں کیوں دلچسپی لوں گی؟"

"دولت سے کس کو دلچسپی نہیں ہوتی!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیسی دولت؟"

"تم معمولی سی ملازمت کرتی ہو۔ ایک مہینے کی تفریح کے لئے تمہیں سال بھر بچت کرنا پڑتی ہے۔ فراغت کی تمنا تو تمہیں بھی ہو گی' اسی لئے میں تمہارے پاس آئی ہوں' تمہیں ایک بہت بہتر کام کی پیشکش کرنے۔ تم نواب پور چلی چلو اور خود کو روشنا ظاہر کرو۔ تمہیں وہاں ایک پُر آسائش اور خوشحال زندگی ملے گی۔ اس کے علاوہ ایک لگی بندھی آمدنی زندگی بھر ملتی رہے گی۔ یہ فراڈ ضرور ہے لیکن بے رحمانہ نہیں۔ تم تصور نہیں کر سکتیں کہ خان بابا تمہیں دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے تمہیں جلدی فیصلہ کرنا ہے کیونکہ خان بابا کسی بھی وقت معقولیت کے زیرِ اثر روشنا کو مردہ تسلیم کر کے صغریٰ کے حق میں وصیت کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی لگتا ہے' اب وہ سال بھر کے مہمان ہیں۔"

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ "کیا وہ بیمار ہیں؟"

"ہاں۔ اور ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ تمہیں جلدی فیصلہ کرنا ہے۔"

"اور خان بابا کے انتقال کے بعد کیا ہو گا؟"

"یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ تم بس خود کو روشنا ثابت کر دو۔ خان بابا کے مرنے کے بعد جائیداد تمہیں مل جائے گی۔ کچھ عرصے بعد تم وہ جائیداد جہانگیر کے نام کر دینا۔ تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ تم یہ کہہ کر رخصت ہو سکو گی کہ تم شہر میں رہنے کی عادی ہو چکی ہو۔ روشنا کی ماں کی چھوڑی ہوئی جائیداد تمہارے ہی نام رہے گی۔ اس سے تمہیں معقول ماہانہ آمدنی حاصل ہوتی رہے گی۔"

"اور صغریٰ کا کیا ہو گا؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد بھی کم نہیں ہے۔ پھر

خان بابا بھی اسے کچھ نہ کچھ دیں گے۔ ویسے بھی وہ شہر کی عادی ہے۔ فارم میں اس نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ سال میں صرف ایک بار یہاں آتی ہے دو تین ہفتے کے لئے۔ تم ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں مزید تفصیل بتاؤں۔"

مجھے خوف آنے لگا۔ وہ اسکیم مجھے کسی پاگل ذہن کا کرشمہ معلوم ہوئی' اس کے باوجود میں نے بے ساختہ کہا۔ "ہاں' یہ ممکن ہے۔" اور دوبارہ کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے پردے برابر کئے اور پلٹ کر کلثوم کو دیکھا۔ "اب مجھے تفصیل سے بتاؤ یہ سب۔"

پردے گرنے کے بعد کمرے کا ماحول سازشی ہو گیا تھا۔ باہر کسی کو علم نہیں تھا کہ اس کمرے میں کیا سازش تیار کی جا رہی ہے۔

☆======☆======☆

مکمل معلومات کی منتقلی میں تین ہفتے لگے۔ تین ہفتے بعد کلثوم کا دعویٰ تھا کہ نواب پور کے زریاب خان' اس کے خاندان اور جاگیر کے بارے میں جتنا کچھ اسے معلوم ہے' اتنا ہی میں بھی جان ہو گئی ہوں۔

"دیکھو کلثوم.......... تمہیں میری واپسی پر دادا کے ردِ عمل کے متعلق سچ سچ بتانا ہو گا۔ ان کے انداز میں ذرا بھی شک ہو تو مجھے فوراً خبردار کر دینا۔" میں نے کلثوم سے کہا۔

ان تین ہفتوں میں مَیں نے بوڑھے زریاب خان کو دادا کہہ کر پکارنے کی عادت ڈال لی تھی۔ جہانگیر اور کلثوم سے بھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم تمہیں تحفظ فراہم کریں گے۔ درحقیقت اسی میں ہماری بہتری بھی ہے۔" کلثوم نے جواب دیا۔

میں ہنس دی۔ "کلثوم' جو کہانی مجھے سنائی گئی ہے' اس میں ایک سقم موجود ہے۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان کتنی ہی سنگین لڑائی کیوں نہ ہو' کوئی لڑکی اس طرح گھربار چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جہانگیر نے اس سلسلے میں مجھے حقیقت نہیں بتائی ہے۔ میرا خیال ہے' روشنا' جہانگیر کی کسی نازیبا حرکت کی وجہ سے جانے پر مجبور ہوئی ہو گی۔"

کلثوم چند لمحے سوچتی رہی' پھر آہستہ سے بولی۔ "جہانگیر یقیناً تمہیں حقیقت بتائے گا مگر تم پر مکمل اعتماد ہونے کے بعد' اور میں نہیں سمجھتی کہ کہانی میں کہیں جھول ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اب کہانی کو مزید ایک بار دہرا لیا جائے۔"

کہانی کوئی پچاسویں بار دہرائی جا رہی تھی۔ کلثوم بہت اچھی استاد ثابت ہوئی تھی۔ حقائق کے معاملے میں اس کا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح تھا۔ اس میں تحمل بھی بلا کا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ میرا تجسّس اور بھڑک اٹھا۔ مجھے یہ احساس بھی نہ رہتا کہ میں کسی سازش میں آلہ کار بننے والی ہوں۔ اس کے برعکس اس کھیل میں درپیش مشکلات اور پیچیدگیاں اور ان سے نمٹنے کا تصور مجھے اور مہمیز کر دیتا۔ البتہ صغریٰ کا خیال مجھے احساس جرم میں مبتلا کر دیتا۔ شاید اسی لئے میں اس کے بارے میں سوچنے سے گریزاں رہتی۔ ویسے بھی میں نے مستقبل کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ میں تو بس کلثوم کی فراہم کردہ معلومات ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ روشنا کا کردار بہ حُسن و خوبی ادا کر سکوں۔

کلثوم مجھے صیقل کرنے کے لئے طرح طرح کے سوالات کرتی۔ ڈرائنگ روم کا نقشہ بتاؤ۔ تمہارا بیڈ روم کیسا ہے۔ کچن کہاں ہے۔ اصطبل میں کتنے گھوڑے ہیں۔ کس گھوڑے کا کیا نام ہے۔ گلے بان کا کیا نام ہے۔ خادمہ زینب کے بارے میں بتاؤ۔

جہانگیر بھی وقتاً فوقتاً موقع نکال کر آتا۔ جاگیر کے ملازموں کے بارے میں وہ کلثوم کی نسبت زیادہ جانتا تھا۔ اس وقت بھی وہ آنے والا تھا۔ میں روشنا کی حیثیت سے جاگیر کے ملازمین کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ آ گیا۔ اس نے سلام کیا اور دوستانہ انداز میں میری خیریت دریافت کی۔

"آج تمہاری آخری کلاس ہے۔ اب تم عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" جہانگیر نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ جہانگیر کی آنکھوں سے برہمی جھلکنے لگی۔ "ہماری توقع کے برعکس صغریٰ وقت سے پہلے ہی نواب پور آ رہی ہے' مجھے شک ہے کہ بڈھے خان نے اسے بلوایا ہے۔ اس بات کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"سمجھ رہی ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر ہم نے فوری طور پر قدم نہ اٹھایا تو خان بابا ہر چیز صغریٰ کے نام کر دے گا۔" جہانگیر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ صغریٰ کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہے۔"

"یہ بات ہے تو میری یعنی روشنا کی آمد خان بابا کو صغریٰ کے متعلق ارادہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکے گی لیکن میرا خیال ہے کہ دادا اپنا فارم تمہارے نام چھوڑیں گے۔"

"تم سمجھ نہیں رہی ہو۔" جہانگیر جھلا گیا۔ "صغریٰ' بوڑھے کی سگی پوتی ہے جبکہ

میں دور پرے کا رشتے دار ہوں اور میں تمہیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ زمیندار نذیر کا لڑکا بشیر' صغریٰ میں دلچسپی لیتا ہے اور بڈھے خان کو یہ بات پسند ہے۔ اگر صغریٰ کی بشیر سے شادی ہوئی تو بشیر کے لیے فارم سنبھالنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال ہے' بشیر کا معاملہ سنجیدہ نہیں ہے۔ صغریٰ شہر میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ وہ تو اب تک بشیر کو بھول چکی ہو گی۔" میں نے رائے زنی کی۔ "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔"

"بہر حال' میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" جہانگیر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے پروگرام بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"تم اتوار کو سہ پہر تین بجے فون کرنا۔ یہ وقت بڈھے خان کے سونے کا ہے۔ فون کلثوم ریسیو کرے گی۔ یوں تمہاری آمد کی خبر بڈھے خان تک پہنچ جائے گی اور اب میں تمہیں وہ اہم باتیں بتادوں' جو ہم نے دانستہ تم سے چھپائی تھیں۔ اب تم ہمارے لئے قابلِ اعتماد ہو اور تمہارا جاننا ضروری بھی ہے۔"

"شکریہ۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"روشنا کے یہاں سے جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی۔"

میں سناٹے میں آ گئی۔ اتنا بڑا دھماکا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے خود کو بہت بڑی مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔ "اور اس کا ذمے دار کون تھا؟"

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "میرے سوا کون ہو سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں فخر کی جھلک بھی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ "اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی گئی۔ خیر........ یہ بتاؤ' دادا کو اس کا علم ہے؟"

"ہاں۔ میں نے یہ بات کلثوم اور خان بابا کے سوا کسی کو نہیں بتائی۔"

"کیا؟" میں حیران رہ گئی۔ "تم نے یہ بات دادا کو بتادی۔ کمال ہے!"

"بہت رسان سے' بڑی احتیاط سے بتائی تھی۔ اس کے باوجود خان بابا پہلے مجھے مارنے اور پھر فارم سے بے دخل کرنے پر تل گیا تھا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خود یہ رسوائی مول لینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم

نہ بتاتے تو دادا کو کبھی پتا ہی نہ چلتا۔" میں نے اعتراض کیا۔

"میں ایسا ہی کھرا آدمی ہوں۔" اس کا لہجہ پھر فخریہ ہو گیا۔

مجھے تو اس کے پیچھے بھی اس کی انا پرستی کارفرما نظر آئی۔ "یہ کب کی بات ہے؟ میرا مطلب ہے' تم نے دادا کو یہ بات کب بتائی؟" میں نے پوچھا۔

"کافی بعد میں۔" جہانگیر نے جواب دیا۔ "روشنا کو گئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ خط لکھ چکی تھی کہ خیریت سے ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ مجھے کوئی نہ کوئی وضاحت تو کرنا ہی تھی۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان کوئی جھگڑا اتنا سنگین نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے میاں کو بتا دیا کہ میں اب بھی روشنا سے شادی کے لئے تیار ہوں۔"

"اور روشنا نے اپنے خط میں اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا؟" میں نے پوچھا۔ "اس نے جانے سے پہلے دادا کو اس سلسلے میں کچھ بتایا بھی نہیں؟"

"نہیں۔ یہ بات وہ انہیں کیسے بتا سکتی تھی۔"

"مجھے جھگڑے والی رات کے بارے میں بتاؤ۔ جس رات روشنا یہاں سے خاموشی سے رخصت ہوئی۔"

"کچھ نہیں۔ اس رات میں اور روشنا دریا کے کنارے ملے۔ روشنا بہت پریشان تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میں نے اُسے دلاسا دیا کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن وہ ہر بات کا الزام مجھے دیتی رہی۔ مجھے برا بھلا کہتی رہی۔ میں بھی کہاں تک سنتا۔ غصے کا تیز ہوں۔ مجھے غصہ آیا تو وہ پاؤں پٹختی ہوئی بڑے میاں کے پاس چلی گئی۔"

میں اس کا یہ رنگ دیکھ چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس رات کے بارے میں بھی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔ مجھے جہانگیر سے پہلی ملاقات اور پھر اس کے الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔ "ویسے تمہارے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ اتنے برسوں کے بعد کتنے مزے سے چلی آئی ہو اور وہ بھی دن دیہاڑے۔ یاد ہے' اس رات تم اور میں یہیں........ دریا کے کنارے گکر پر چل رہے تھے۔ آج بھی تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں تمہارے پیچھے پیچھے اس طرح چلا آؤں گا تو تم یوں تنہا اس طرف کا رخ نہ کرتیں۔"

اب میں اس کے الفاظ کی معنویت اور اس کی حیرت کا سبب سمجھ سکی تھی۔ مگر میں دلدل میں قدم رکھ چکی تھی۔

☆======☆======☆

سڑک سے ہٹ کر ایک تنگ اور کنکریلا راستہ زریاب خان کی جاگیر کی طرف جاتا تھا۔ میں بس سے اتری اور کنکریلے راستے پر چل دی۔ میں طے شدہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے پہنچی تھی۔ شاید اسی لئے کوئی مجھے ریسیو کرنے نہیں آیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں دو سوٹ کیس تھے۔

موڑ مڑتے ہی چراگاہ نظر آئی‘ جس کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ میرا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ میں ایک لمحے کے لئے رک کر باڑھ کے پار دیکھتی رہی۔ پھر میں باڑھ کے ساتھ ساتھ چل دی۔ بالآخر مجھے پختہ رہائشی عمارت کا داخلی دروازہ نظر آیا۔ دور ہی سے نظر آگیا کہ پرانے طرز کی وہ خوب صورت عمارت بے حد وسیع و عریض ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی میری نظر باغیچے پر پڑی۔ پھولوں کی مہک غیر معمولی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بلند و بالا درخت پہرے داروں کی طرح ایستادہ تھے۔

میں دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ میری توجہ دائیں سمت ایک جلے ہوئے کھنڈر کی طرف منعطف ہوئی‘ جو کسی زمانے میں یقیناً پُرشکوہ عمارت رہی ہوگی۔ آتش زنی کے آثار بے حد نمایاں تھے۔ عمارت چھت سے محروم تھی۔ دیواروں میں دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ شکستہ اور آتش زدہ عمارت اب تک اپنی بنیادوں پر کیسے قائم تھی۔ وہ یقیناً آدم خان کی حویلی تھی‘ جس کے بارے میں جہانگیر نے مجھے بتایا تھا۔

میں جلی ہوئی حویلی کو متجسس نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ بیرونی دیوار ایک جگہ کے سوا پوری طرح سلامت تھی۔ وہ جہاں سے چٹخی ہوئی تھی‘ وہاں صنوبر کا ایک بلند درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ درخت درحقیقت عمارت کے اندر لگا تھا لیکن گزرتے برسوں کے ساتھ وہ تیزی سے پھیلا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے طاقت ور تنے نے دیوار توڑ کر اپنی نمو کے تقاضے پورے کر ڈالے تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کا ملبہ درخت کے سامنے مغلوب دشمن کی طرح ڈھیر پڑا تھا لیکن درخت خود بھی مغلوب ہو چکا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کو امربیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہی نہیں‘ اس نے درخت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بیل کے نیچے سے کہیں کہیں درخت کی مُردہ شاخیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ درخت کی ایک نچلی شاخ‘ جو بے حد موٹی اور لمبی تھی‘ تنے سے جدا ہو چکی تھی اور اس کے نتیجے میں درخت کے تنے میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ خلا اتنا بڑا تھا کہ اُلّو اس میں بہ آسانی اپنا گھونسلا بنا سکتے تھے۔

میں دیر تک کھڑی بیل سے ڈھکے ہوئے مُردہ درخت کو دیکھتی رہی۔ پھر میری نظر سرسبز چراگاہ کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ زندگی اور موت کتنی قریبی سہیلیاں ہیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نروس ہو رہی ہوں۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور گلے کی نسیں دکھ رہی تھیں۔ میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کے لئے گہری گہری سانسیں لیں اور خود کو دلاسا دیا۔ جو کھیل میں کھیلنے جا رہی تھی‘ اس میں شکست کا امکان تو تھا لیکن اس شکست سے کوئی بڑا نقصان بھی وابستہ نہیں تھا۔

میں عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ثمینہ مر چکی تھی۔ اب اسے زندہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اب میں روشنا فتح یاب تھی اور اپنے گھر واپس آ رہی تھی۔ پُرشکوہ عمارت سے مجھے تمول کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی؟ آخر میں دولت ہی کی خاطر تو یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوئی تھی۔

کلثوم نے جاگیر کا پورا نقشہ ذہن نشین کرا دیا تھا‘ اسی لئے مجھے اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ مکان دو منزلہ تھا۔ کھڑکیاں بہت کشادہ تھیں اور دیواریں بہت چوڑی۔ ہر چیز عمارت کی مضبوطی کا احساس دلاتی تھی۔ صدر دروازے کے سامنے باغیچہ تھا اور باغیچے کے اُس طرف وسیع و عریض چراگاہ۔ باغیچے کی دائیں جانب دریا بہہ رہا تھا۔ دریا عمارت کی سطح سے خاصا نیچے تھا مگر اس کے بہنے کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ بائیں سمت بڑا سا صحن تھا۔ وہاں اصطبل اور غلہ گودام تھا۔ مرغیاں کُڑکُڑاتی پھر رہی تھیں۔

میں اس منظر میں اس طرح کھو گئی کہ مجھے احساس بھی نہ ہوا‘ کوئی میری طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ اتنی تیزی سے قریب آیا کہ مجھے سوچنے کا موقع بھی نہ ملا۔ اپنے بہت قریب قدموں کی چاپ سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ و سپید رنگت کا مالک تھا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ”آقا زادی روشنا!“ اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور مسرت بھی۔

کلثوم اور جہانگیر کے کھینچے ہوئے نقشے کی مدد سے میں اُسے فوراً ہی پہچان گئی۔ وہ مویشیوں کا رکھوالا تھا...... قاسم۔ مگر میں نے احتیاط کے پیشِ نظر اس کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے لئے وہ آزمائش کے اَن گنت لمحوں میں سے پہلا لمحہ تھا۔ مجھے محتاط رہنا تھا اور جلد بازی سے گریز کرنا تھا۔ ”تم نے مجھے پہچان لیا!“ میرے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ ”شکریہ۔ بے حد شکریہ۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں واقعی گھر واپس آ گئی

ہوں۔"

"پہچانوں گا کیسے نہیں۔ کلثوم بی بی نے نہ بتایا ہوتا تب بھی میں آپ کو پہچان لیتا۔ مجھے بہت خوشی ہے آقازادی۔ یہ گھر آپ کی آمد کو ترس رہا تھا۔"

"تم کیسے ہو؟" میں نے پوچھا۔ پھر خود ہی کہا۔ "صحت تو تمہاری ٹھیک ٹھاک ہو رہی ہے۔ کمال ہے' آٹھ سال گزر گئے اور تم ایک دن بھی بڑے نہیں لگ رہے ہو۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں اور زینب بھی۔ آپ کو پتا تو چل گیا ہو گا کہ میں نے زینب سے شادی کرلی ہے۔ زینب آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ جب سے آپ کے آنے کا سنا ہے مگن ہو رہی ہے۔ اس وقت وہ باورچی خانے میں آپ کے لئے جھنکار تیار کر رہی ہو گی۔"

"جھنکار؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"اب یہ نہ کہئے گا کہ آپ جھنکار بھول گئیں۔ آپ ہر روز چائے کے ساتھ جھنکار کی فرمائش کرتی تھیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں' میں بھولی تو نہیں ہوں۔ البتہ آٹھ سال بعد یہ لفظ سننا عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ زینب کو اب تک جھنکار یاد ہے اور سناؤ قاسم.......... دادا کیسے ہیں؟"

"خان بابا بڑھاپے کے باوجود شیر ہیں شیر۔" اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "لیکن آپ کو شاید وہ بدلے بدلے لگیں گے۔"

"ہاں۔ وقت بھی تو بہت بیت گیا ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ میرا گلا پھر خشک ہونے لگا۔

"جی ہاں آقا زادی۔ آپ نے بہت ظلم کیا کہ ہم لوگوں کو اس طرح' بغیر کچھ بتائے چھوڑ گئیں۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

میں مسکرا دی۔ "چلو' اب تلافی ہو گئی۔ اب میں سمجھوں گی کہ میں کبھی یہاں سے دور رہی ہی نہیں۔"

اس نے اداس نگاہوں سے جلی ہوئی حویلی کے کھنڈر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اصل اور بڑی تبدیلی تو یہ ہے' کلثوم بی بی نے آپ کو حویلی کے بارے میں بتایا ہو گا؟"

"ہاں۔ چار سال پہلے کی بات ہے نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔ "آقا زادی' اب کہیں نہیں جایئے

گا۔ اپنے دادا کے ساتھ رہئے گا ہمیشہ۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "اب آپ کبھی نہ جایئے گا یہاں سے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور چراگاہ کی طرف چل دیا۔ میں چند لمحے اُسے دیکھتی رہی' پھر صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں دروازے سے کچھ دور تھی کہ کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جہانگیر تھا۔ "خوش آمدید روشنا۔" اس نے گرم جوشی سے کہا۔ "تم وقت سے کچھ پہلے آ گئیں۔"

اس سے اس طرح ملاقات خلافِ توقع تھی۔ میں پھر نروس ہو گئی۔ "کیسے ہو جہانگیر؟" میں نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

"جیسا ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔" اس نے چہک کر کہا' پھر سرگوشی میں بولا۔ "یہ کھڑکیوں کا رخ ہے۔ ممکن ہے' اس وقت کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو۔" پھر وہ زور سے بولا۔ "آخر تم آ گئیں نا۔"

"ہاں' میں آ گئی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے لئے آئی ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ درحقیقت مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اُسے اس طرح اچانک میرے سامنے نہیں آنا چاہئے تھا۔

کھڑکیوں کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے دانت نکالتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "بہت خوب۔ تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔"

میں دکھاوے کے لئے مسکرا دی۔ مگر میرے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ "یہ کبھی نہ بھولنا کہ میں اس ڈرامے میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہوں۔ اس سے ہٹ کر مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔" مجھے اس کا آخری تبصرہ پسند نہیں آیا تھا۔

"جو تمہاری مرضی.........." اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"دادا کہاں ہیں؟"

"وہ سو رہے ہیں۔ ان سے تمہاری ملاقات بعد میں ہو گی۔ کہو تو میں تمہیں پہلے جاگیر کی سیر کرا دوں؟"

"نہیں۔ میں مقامات سے پہلے انسانوں میں دلچسپی لینا چاہتی ہوں۔ پہلے تو تم مجھے کلثوم سے متعارف کراؤ۔ میرا خیال ہے' زینب نے میرے لئے جھنکار بنائی ہو گی۔" میں نے نہایت سادگی سے کہا۔ پھر میں اس کی حیرانی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

جہانگیر نے زبان پھیر کر اپنے ہونٹوں کو تر کیا اور سرگوشی میں بولا۔ "یہ.......... یہ

بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟ یہ......... ناممکن ہے!"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم بھی مجھ پر شک کر رہے ہو۔ تب تو میری کامیابی یقینی ہے۔ اس کا مطلب ہے' میں شاندار جا رہی ہوں۔"

اس نے سر جھٹکا۔ "یہ بات تو کلثوم کو بھی معلوم نہیں' تمہیں کیسے معلوم ہوئی۔"

"ابھی چند لمحے قبل قاسم نے بتایا تھا۔ اب یہ بتاؤ' یہ جھنکار ہے کیا بلا؟ ایسی کوئی لاعلمی بڑی آسانی سے مجھے لے ڈوبے گی۔"

"الائچی کے بگھار والی سویوں کو روشنا جھنکار کہتی تھی۔ بگھار کے چھَن چھَن کی وجہ سے۔" اس نے وضاحت کی۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ "ویسے تم بہت ذہین اور حاضر دماغ ہو۔ مجھے تمہاری کامیابی میں واقعی کوئی شبہ نہیں رہا۔ آؤ......... چلیں؟"

☆======☆======☆

زینب واقعی بگھاری ہوئی سویاں پکا رہی تھی۔ باورچی خانے کی فضا میں الائچی کے بگھار کی مہک تھی۔ میں باورچی خانے سے کچھ فاصلے پر ٹھٹک گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو فراڈ مجھے ایک چیلنج اور خوش گوار ایڈونچر لگ رہا تھا' اب برا لگنے لگا۔ میں وہاں جہانگیر کے لیے ایک فارم' ایک جاگیر جیتنے کی غرض سے داخل ہوئی تھی۔ مگر اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ تو ایک جیتا جاگتا گھر ہے۔ ایک نسل کی خوشیوں کا امین' مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ گھروں کے ساتھ فراڈ نہیں کیا جاتا۔ گھر تو اپنے دُکھ سکھ سمیت گھر والوں کے ہوتے ہیں۔

میں کھڑی ہچکچاتی رہی لیکن وہاں میری ہچکچاہٹ بھانپنے والا کوئی نہیں تھا' جہانگیر اور کلثوم کے سوا۔ زینب نے دانستہ پہلے مجھے کلثوم سے ملنے کا موقع دیا تھا۔ آخر کلثوم اب اس گھر کی منتظم تھی۔ کلثوم ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے یوں گھور رہی تھی' جیسے بولنے سے قاصر ہو۔ وہ غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔

جہانگیر نے کہا۔ "کلثوم......... یہ ہے روشنا۔ اور روشنا' یہ میری بہن کلثوم ہے۔ اس نے ہم سب کی بڑی خدمت کی ہے۔"

"ان سے فون پر خاصی طویل گفتگو ہوئی تھی۔" میں نے جہانگیر سے کہا اور پھر کلثوم کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیا حال ہے کلثوم؟ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گھر واپس آ کر بہت خوش ہوں۔"

کلثوم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "خوش آمدید روشنا۔ ویسے یہ بات بڑی عجیب سی ہے کہ میں تمہیں تمہارے گھر میں خوش

آمدید کہہ رہی ہوں لیکن پچھلے سات برسوں میں یہ گھر مجھے اپنا گھر بھی لگنے لگا ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری واپسی ہم سب کے لئے باعث مسرت ہے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"میں آپ کی شکرگزار ہوں۔ یہ گھر یقیناً آپ کا بھی ہے۔ آپ نے اس کی نگہداشت کی ہے۔ خیال رکھا ہے اس کا۔" میں نے کہا۔ "اور زینب کہاں ہے؟"

کلثوم نے مجھ پر تیز نگاہ ڈالی۔ "وہ باورچی خانے میں ہے۔"

میرا استفسار گویا ایک اشارہ تھا۔ زینب باورچی خانے سے نکلی۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھ پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔ "روشنا آ گئی ہیں۔" کلثوم نے جلدی سے کہا۔

"نہ میں اندھی ہوں' نہ بہری۔ مجھے نظر آ رہا ہے۔" زینب نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "میں یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہوں کہ اتنا عرصہ تم کہاں رہیں؟ تم نے یہ کیا حال بنا لیا ہے اپنا۔ شہر میں رہ کر کیا ملا تمہیں؟ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات اب تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

جہانگیر نے مجھے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ حالانکہ اُسے فکرمند ہونے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ کلثوم کی بیان کردہ تفصیل مجھے یاد تھی۔ کلثوم نے بتایا تھا' زینب' روشنا سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے۔ وہ روشنا کے خلاف کسی اور سے ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتی۔ زبان کی بہت تیز ہے۔ مجھ سے چڑتی ہے لیکن میں اسے برداشت کر لیتی ہوں۔ ایک تو وہ بہت محنتی عورت ہے اور پھر قاسم بھی اپنے کام میں یکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ہمارے لئے بہت کارآمد ہیں۔

"تم نے ہم سب کو بہت ستایا' بہت رُلایا ہے۔" زینب نے تند لہجے میں کہا۔ "اس رات میں نے تمہاری اور خان بابا کی تلخ کلامی سنی تھی لیکن میں نے سوچا تھا' صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پر تم نے تو کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ چھوٹے بچوں کی طرح ناراض ہو کر گھر سے بھاگ گئیں آدھی رات کو........."

"آدھی رات تو نہیں تھی وہ۔" میں نے ہنستے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے' وہ طلوع آفتاب سے کچھ پہلے کی بات تھی۔" میں نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ "زینب......... جو کچھ ہوا' میں اس پر شرمندہ ہوں۔ مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔ مجھے خوش آمدید کہو اس گھر میں۔ میں اس تمام عرصے میں بہت ناخوش رہی ہوں۔"

زینب کا چہرہ جیسے چنچ سا گیا۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ کلثوم نے جلدی سے مداخلت کی۔ ”خان بابا جاگ گئے ہوں گے۔ چلو' میں تمہیں ان سے ملوا دوں۔“

میں نے زینب کو بغور دیکھتے ہوئے کلثوم سے کہا۔ ”اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ان کے پاس جاؤں گی.......... یہ ضروری ہے' آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟“

جہانگیر نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا اور کلثوم سے بولا۔ ”روشنا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ مہمانوں کا سا برتاؤ مت کرو۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر روشنا نے میری بات کا یہ مطلب لیا تو مجھے افسوس ہو گا۔“ کلثوم نے کہا۔

میں زینب کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں چلی آئی۔ کلثوم بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ مناسب ترین موقع تھا۔ چنانچہ میں نے مسکراتے ہوئے زینب سے کہا۔ ”خدا تمہیں خوش رکھے زینب' آج میں برسوں بعد جھنکار کھاؤں گی۔“

کلثوم ایک دیگچی کا ڈھکنا اٹھا رہی تھی۔ میری بات سن کر ڈھکنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے ایک لمحے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا' پھر دوبارہ دیگچی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے برعکس زینب کی آنکھوں میں ایک لمحے کو محبت سی چمکی پھر اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہ نہ سمجھو کہ یہ جھنکار میں تمہارے لئے پکا رہی ہوں۔ جاؤ.......... تم اپنے دادا سے مل آؤ۔“

میں باورچی خانے سے نکل آئی۔ کلثوم مجھے عمارت کے متعلق سب کچھ بتا چکی تھی اور وہ مجھے یاد بھی تھا۔ میں بے حد پُرسکون تھی۔ میری شناخت کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس سخت مرحلے سے میں بہت آسانی سے گزر گئی تھی۔

دادا جی کا کمرا اوپری منزل پر تھا۔ میں نے اوپر جانے سے پہلے چند منٹ تنہا رہنا پسند کیا۔ میں اس عرصے میں سوچنا اور اپنے اعتماد کو فزوں تر کرنا چاہتی تھی۔ میں بڑے ہال کمرے میں رک کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر میں زینے کی طرف بڑھ گئی۔ زینے کی ریلنگ پر ہاتھ لگتے ہی جیسے انجانی یادوں کے دریچے کھل گئے۔ وہ سب کچھ مجھے بے حد جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ میں ہندو ہوتی تو یہی سوچتی کہ میں کسی پچھلے جنم میں اس گھر میں رہی ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے روشنا کے کردار کو خود پر پوری طرح طاری کر لیا تھا۔

اوپر پہنچ کر میں نے دادا جی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

دادا جاگ چکے تھے۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بے حد کشادہ' روشن اور ہوادار کمرا تھا۔ ایک چھوٹی میز پر تین فریم شدہ تصویریں رکھی تھیں۔ ان میں ایک تصویر جہانگیر کی تھی۔ وہ بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ دوسری تصویر شاید صغریٰ کی تھی۔ وہ بے حد حسین اور معصوم لڑکی تھی۔ تیسری تصویر کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں وہاں سے اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ دادا نے کمبل پھیلاتے ہوئے اپنے پاؤں سمیٹے اور اٹھ بیٹھے۔ بیٹھا ہونے کے باوجود ان کا قدو قامت منہ سے بول رہا تھا۔ وہ دراز قد تھے۔ سر پر گھنے سفید بال تھے۔ بھنویں بھی گھنی تھیں۔ آنکھیں خوبصورت اور کشادہ تھیں مگر کچھ دھندلا گئی تھیں۔ وہ وجیہہ آدمی تھے مگر اُن کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”اندر آ جاؤ۔“ انہوں نے گمبھیر آواز میں پکارا۔

میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑی رہی۔ پھر میں نے لہجے میں درد سموتے ہوئے پکارا۔ ”دادا جی!“

ان کی آواز اور الفاظ' دونوں میں سختی تھی۔ ”کہو روشنا!“ انہوں نے کہا۔

میں ایک لمحے کو حیران رہ گئی۔ آٹھ برس بعد یہ عجیب ملاپ تھا۔ اتنے عرصے کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں تو ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دادا جی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ لپک کر مجھے گلے لگا لیں۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا' خود ہی کرنا تھا۔ میں آگے بڑھی اور مسہری کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکا لیا۔ پھر میں نے اُن کے ہاتھ تھام لئے۔ وہ دُبلے پتلے ہاتھ تھے۔ نیلی نسیں ابھری ہوئی تھیں مگر وہ حیرت انگیز طور پر مضبوطی کا تاثر دے رہے تھے۔ ”دادا جی' میں شرمندہ ہوں' بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ کیا آپ دوبارہ مجھے قبول نہیں کر سکتے؟“

دادا نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم مستحق تو اسی سلوک کی ہو کہ میں انکار کر دوں۔“ انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہم تو سمجھے تھے کہ خدانخواستہ تم مر چکی ہو۔“

”میں شرمندہ ہوں دادا جی۔“

دادا نے ہاتھ بڑھا کر میری ٹھوڑی اونچی کی اور چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ وہ بہت طویل اور گراں بار لمحہ تھا۔ میں دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے اور انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ داد مجھے دیکھتے رہے پھر سخت لہجے میں بولے۔ ”تم ناخوش رہی ہو۔ ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دادا نے ہاتھ ہٹایا۔ میری پیشانی مسہری کی پٹی سے جا لگی۔ میں انہیں اپنی صورت دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"ناخوش تو ہم رہے ہیں۔" انہوں نے میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں نے کن انکھیوں سے جہانگیر کی تصویر کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے سوچا' دادا کو حقیقت بتا دوں کہ جہانگیر انہیں دھوکا دے رہا ہے۔ اس نے مجھے دولت کا لالچ دے کر ان کی پوتی روشنا کا کردار ادا کرنے پر مامور کیا ہے لیکن سب کچھ بے سود تھا۔

کمرے میں تا دیر خاموشی رہی۔ پھر کمرے کی کھلی کھڑکی میں رنگین پروں والی ایک چڑیا آ بیٹھی اور چہچہانے لگی۔ میں نے اپنا سر جھکا ہوا اٹھایا۔ دادا مجھے بغور دیکھنے لگے۔

"کرسی لو اور میرے قریب بیٹھ جاؤ تاکہ میں تمہیں جی بھر کے دیکھ سکوں۔" دادا نے کہا۔

میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اپنے ہاتھ گود میں رکھ لئے تھے۔ میری حالت اس بچی کی سی تھی' جسے ہوم ورک نہ کرنے پر گوشمالی کا خدشہ ہو۔ دادا ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر ان کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ "تمہیں بہت کچھ بتانا ہے۔ لڑکی۔ بس اب شروع ہو جاؤ.........."

میں زینے سے اتر رہی تھی کہ کلثوم مجھے نظر آئی۔ وہ شاید میری ہی منتظر تھی۔

"کہو......... ملاقات کیسی رہی؟" میرے نیچے پہنچتے ہی اس نے پوچھا۔

"میری توقعات سے بڑھ کر اچھی رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"انہیں تم پر شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں' ذرا بھی نہیں۔ انہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں نقلی ہو سکتی ہوں۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

کلثوم کے چہرے پر طمانیت بکھر گئی۔ "تفصیل نہیں بتاؤ گی؟"

"انہوں نے پوچھا کہ یہاں سے جانے کے بعد میں کہاں کہاں رہی' کیا کیا کرتی رہی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔"

"انہوں نے تم سے یہاں سے جانے کی وجہ نہیں پوچھی؟"

میں نے سر جھکا لیا۔ "وجہ انہیں معلوم تھی تو مجھ سے کیوں پوچھتے وہ۔ تاہم میں نے انہیں بتا دیا کہ میری اور جہانگیر کی یکجائی کے بارے میں اب بالکل نہ سوچا جائے۔" میں نے کہا اور نظریں اٹھا کر کلثوم کے چہرے پر ردِ عمل دیکھا۔ پھر میں نے وضاحت کی۔ "یہ

ضروری تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے اور جہانگیر کے بارے میں اس انداز سے سوچا جائے۔ ورنہ دادا جی ضرور سوچتے۔ بہرحال وہ مطمئن ہو گئے۔"

"ٹھیک ہے۔" کلثوم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سازشی انداز میں کہا۔ "اب بڑے میاں نیچے آنے والے ہی ہوں گے۔ تم رات کو تفصیل سے بتانا مجھے۔"

"تمہارا مطلب مکمل رپورٹ سے ہے تو یہ ممکن نہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ ایسا لگا' جیسے میں نے اُسے تھپڑ مار دیا ہے۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ایک بے حد دشوار کردار کر رہی ہوں۔ اسے خوش اسلوبی سے نبھانے کی یہی ایک صورت ہے کہ میں اسے خود پر طاری کر لوں۔ اس کے لئے تسلسل ضروری ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ میں آدھے گھنٹے روشنا کا کردار ادا کروں اور پھر تمہیں یا جہانگیر کو تفصیل سنا کر تمہارے تبصرے سنوں۔ ہاں' مجھے کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو بلا جھجک طلب کر لوں گی۔ مگر مجھے روشنا ہی رہنے دو۔"

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی۔ پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔ "ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ یہی بہتر ہے اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہیں ہماری مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"اب میں اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔ صغریٰ کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کل رات اس کا فون آیا تھا۔ وہ بدھ کو آ رہی ہے۔ فون قاسم نے ریسیو کیا تھا۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتاتے سنا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"بدھ؟ گویا ہمارے پاس دو دن ہیں اپنا کھیل جمانے کے لئے۔" میں نے کہا۔ "اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر میں بڑے اعتماد سے زینے کی طرف بڑھ گئی۔

میرا کمرا بھی کشادہ اور ہوادار تھا۔ کھڑکیاں باغیچے کی طرف کھلتی تھیں۔ جہانگیر نے سوٹ کیس مسہری کے پاس رکھ دیئے تھے۔ وہ میرا ہینڈ بیگ بھی لے آیا تھا جو میں باورچی خانے میں بھول آئی تھی۔ یہ اس نے عقل مندی کی تھی کیونکہ بیگ میں میرا شناختی کارڈ

اور کچھ دیگر کاغذات موجود تھے۔ میں نے بیگ کھول کر دیکھا۔ پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ کسی نے بیگ کی تلاشی لی ہے۔ میں مسکرا دی۔ یہ یقیناً جہانگیر یا کلثوم میں سے کسی کی حرکت تھی۔ میں نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ وہ ثمینہ کی چیزیں تھیں۔ تلاشی لینے والے کو اب میرے ثمینہ ہونے پر یقین آگیا ہو گا۔ میں نے آگے بڑھ کر شناختی کارڈ اور کاغذات آتش دان میں ڈال دیئے۔ میں کسی غلطی کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں پُرسکون ہو گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی اور باہر باغیچے میں جھانکتی رہی۔ فضا میں پھولوں کی مہک تھی۔ باغیچے کے عقب میں سرسبز چراگاہ سبز قالین کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ میں نے باغیچے کو غور سے دیکھا۔ وہ روشنا کا باغیچہ تھا۔

☆======☆======☆

شام کی چائے کے لئے نیچے آتے ہوئے میں نے شدت سے آرزو کی کہ کاش جہانگیر چائے پر موجود نہ ہو۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ جہانگیر واقعی موجود نہ تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ چائے کی میز پر دادا جی مجھے گزشتہ آٹھ سال کے دوران پیش آنے والے اہم واقعات اور علاقے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق بتاتے رہے۔

چائے کے بعد وہ مجھے باہر لے آئے۔ صحن میں پہنچ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یہ سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا ہے؟"

فی الوقت تو کچھ کہنا مشکل ہے۔"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"کچھ چیزیں یقیناً بدل گئی ہیں۔ مثلاً یہ دیوار نئی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں ہمیشہ فارم کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ یہ میرے تصور میں ہر لمحے موجود رہا ہے لیکن اسے سچ مچ دیکھنا عجیب سا لگ رہا ہے......... خواب سا۔"

"ہوں.......... ہوں.........." وہ مجھے گھورتے رہے۔ پھر بولے۔ "جہانگیر اچھا لڑکا ہے۔"

"ج......... جی ہاں۔" میں گڑبڑا گئی۔

انہوں نے شاید میری گڑبڑاہٹ کا غلط مفہوم لیا۔ اُن کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں گڑے مُردے نہیں اکھاڑوں گا۔ میں نے جہانگیر کو اس سلسلے میں کبھی معصوم نہیں سمجھا لیکن اس ایک شکایت کے سوا مجھے اس سے کبھی کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی اور اس سلسلے میں اس نے تلافی کی پیشکش کی تھی۔ یہ اس کی

شرافت کا ثبوت ہے۔"

میں خاموش رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب یہ موضوع ختم۔" انہوں نے کہا۔ "میں یہ بتا دوں کہ گزشتہ آٹھ سال میں جہانگیر نے بیٹوں سے بڑھ کر میری خدمت کی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"تم بچوں کی طرح مجھ سے روٹھ کر چلی گئیں لیکن جہانگیر نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میرے نزدیک اس نے ہر غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ اس نے فارم پر بہت محنت کی ہے۔"

میں مسکرا دی۔ "دادا جی، آپ مجھ سے کیا توقع کر رہے ہیں؟ میں روٹھ کر چلی گئی۔ مگر آپ کو کبھی نہیں بھولی۔ میں نے اپنی حماقت کی کم سزا نہیں بھگتی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر دادا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم بالکل نہیں بدلیں لڑاکا لڑکی۔ تم پھر مجھ سے لڑنے آئی ہو۔"

"نہیں پیارے دادا جی، نہیں، لیکن میں جہانگیر کی تعریف کا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔ میں یہ بات صاف صاف بتا دوں، جہانگیر کا اور میرا ساتھ ناممکن ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہ کہہ چکی ہو۔ مگر میں عورتوں کے بیانات پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ بعض اوقات محبت اور نفرت میں تمیز نہیں کر پاتیں۔"

"محبت نہ نفرت، میرا جہانگیر سے کوئی مضبوط ناتا نہیں۔ صرف اُسی کی وجہ سے تو میں واپس آنے سے گریز کرتی رہی۔ میں تو اس کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہتی۔ یہ تو آپ کی اور اس گھر کی محبت ہے، جو جہانگیر کی موجودگی کے باوجود مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔" میں نے کہا اور مسکرائی۔ "آپ اصل بات بتائیں۔ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"تم تو صرف اتنا جانتی ہو کہ میری موت کے بعد یہ فارم تمہارا ہو گا۔ تم نے یہ تو نہیں سوچا ہو گا کہ اس دوران میرے خیالات تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔"

"جی ہاں.......... یقیناً۔"

"مگر اب تم واپس آگئی ہو۔"

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کھل کر کہیں۔"

وہ مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ "بات یہ ہے کہ اب میرے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے احتجاج کرنے سے روک دیا۔ "یہ حقیقت

ہے جس سے سب واقف ہیں۔ میری صحت اب جواب دے رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ انصاف نہیں کہ آٹھ سال بعد تم اچانک آؤ اور میں جہانگیر سے سب کچھ چھین کر تمہیں سونپ دوں.......... اے.......... ہنس کیوں رہی ہو تم؟“

مجھے واقعی ہنسی آ گئی تھی۔ تاہم میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ آپ ہر چیز جہانگیر کے نام چھوڑ رہے ہیں؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا لیکن میرا خیال ہے‘ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔“

”جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا‘ پھر بولے۔ ”میں کافی عرصے سے ان چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تمہیں پتا ہے‘ صغریٰ بدھ کو یہاں پہنچ رہی ہے۔“

”جی ہاں۔ کلثوم نے مجھے بتایا تھا۔“

”میں نے اسے بلوایا ہے۔ میں نے اپنے وکیل کو بھی شہر سے بلوا لیا ہے۔ میں اب ہر ذمے داری اتار دینا چاہتا ہوں۔“ دادا نے کہا۔ ”میں اس گھر میں سب کو اکٹھا دیکھنا چاہتا تھا۔“

”گویا آپ اس روز ہم سب کو ہمارے مستقبل کے بارے میں بتائیں گے؟“

”دیکھو لڑکی‘ میں اپنے عزائم کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم یہ توقع کر رہی ہو گی کہ میں تمہیں نظرانداز کر کے صغریٰ کو سب کچھ سونپ دوں گا سوائے فارم کے‘ جس پر جہانگیر کا حق ہے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں؟ اس معاملے میں نہ میں کچھ کر سکتی ہوں‘ نہ جہانگیر کچھ کر سکتا ہے۔ جو کچھ آپ کے جی میں آئے گا‘ آپ وہی کریں گے۔“

دادا جی کی آنکھوں میں تبسم سا چمکا۔ ”تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہاری واپسی سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے‘ چلو دریا کے کنارے چلتے ہیں۔ میں تمہیں ایک نئی گھوڑی سے ملوا دوں۔“

میں ان کے ساتھ چلتی رہی۔ دریا کے بہاؤ کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ دادا جی نے اصطبل کا دروازہ کھولا۔ سیاہ رنگ کی ایک گھوڑی دم ہلاتی ہوئی ہماری طرف بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں ہرن کی آنکھوں جیسی نرماہٹ اور چوکنے پن کا امتزاج تھا۔

”بہت خوبصورت ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”ہے نا؟“ دادا جی کے لہجے میں بے پناہ محبت تھی۔ ”میں نے یہ گھوڑی تین سال پہلے آدم خان سے خریدی تھی لیکن اِسے سدھایا نہیں گیا۔ پھر بھی میرا خیال ہے‘ تم اِسے رام کر لو گی۔ تمہیں یہ ہنر آتا ہے۔“

گھوڑی نے دادا جی کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سانسیں مجھے اپنے وجود کو چھوتی محسوس ہوئیں۔ اسی وقت عقب سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں پیچھے ہٹی اور دروازے سے جا لگی۔ دادا نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے روشنا؟“ قدموں کی آہٹ اور قریب آ گئی تھی۔

”نہیں دادا جی.......... کوئی بات نہیں۔“ میں نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ چاپ اب بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

دادا جی مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”کچھ تو ہے۔ تمہارا چہرہ سپید پڑ گیا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”کیا تم اس گھوڑی سے خوف زدہ ہو؟“

میں نے بڑی مشکل سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”میں گھوڑی سے خوف زدہ ہوں گی۔ یہ تو ریشم ہے ریشم..........“ میں نے لرزتا ہوا ہاتھ گھوڑی کی طرف بڑھایا۔ میں دعا کر رہی تھی کہ دادا جی میرے ہاتھ کی لرزش نہ دیکھ سکیں۔ گھڑسواری سے بچنے کے لئے میں نے ایک بار اپنے زخمی ہونے کی کہانی گھڑ کر سنا دی تھی لیکن یہاں صورتِ حال کچھ اور تھی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دادا جی نگاہوں میں الجھن اور تجسس لئے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا دھیان بٹانے کے لئے پوچھا۔ ”آدم خان بھی شہر چلا گیا؟“

”ہاں۔ لیکن وہ اگلے ہفتے یہاں آ رہا ہے۔ نواز نے بتایا ہے مجھے۔“ دادا جی نے جواب دیا۔

”میں تو سمجھی تھی‘ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ حویلی جل جانے کے بعد اس کا یہاں رکھا ہی کیا ہے۔“

اُسی وقت عقب سے جہانگیر نے پکارا۔ ”خان بابا.......... ! روشنا!“

گھوڑی کی زبان اب میرے ہاتھ پر تھی۔ میں جنگلے دار دروازے سے چپکی ہوئی تھی۔ مزید پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ دادا جی نے جواباً پکارا۔ ”ہم یہاں ہیں جہانگیر۔“

جہانگیر نمودار ہوا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے ترحم تھا۔ اس نے ایک نظر میں

صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب جھلکا۔ پھر اس نے سختی سے گھوڑی کو پیچھے دھکیل دیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت دادا جی کی توجہ کسی اور طرف تھی۔ جہانگیر نے ایک مرمت طلب ٹریکٹر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مجھے اپنے خوف پر قابو پانے کی مہلت مل گئی۔ مجھے احساس تھا کہ جہانگیر کی آمد اتفاقیہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے دادا کے ساتھ اصطبل کی طرف آتے دیکھا ہو گا اور اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ذرا سی کوتاہی سے بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ وہ بروقت میری مدد کے لئے پہنچا تھا۔

ہم اصطبل سے نکل آئے۔ دادا جی آگے آگے چل رہے تھے۔ جہانگیر نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔ "تم ڈرائیو کر سکتی ہو روشنا؟"

میں نے پہلے اثبات میں اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

☆======☆======☆

جہانگیر رات کے کھانے پر بھی موجود نہیں تھا۔ دادا جی بجھی ہوئی یادوں کی راکھ کریدنے میں مصروف تھے۔ وہ بار بار پوچھتے۔ "تمہیں یاد ہے روشنا؟" کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور کھڑکی کے پاس کرسی لگا کر بیٹھ گئی۔ میں پھولوں کی مہک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دن بھر کی سرگرمیوں کو ذہن میں دہراتی رہی۔ پھر میں نے جہانگیر کو آتے دیکھا۔ شاید وہ کھانا کھانے آیا تھا۔ مکان کا بغلی دروازہ دوبارہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گئی کہ جہانگیر کھانا کھا کر واپس جا رہا ہے۔ میں اٹھی اور دبے قدموں باہر نکل آئی۔ دریا کے کنارے والی سرسبز ڈھلان پر میں نے اُسے جا لیا۔

وہ میرے لپکتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر مڑا اور کھڑا ہو کر میرا انتظار کرنے لگا۔ اس نے خیر مقدمی مسکراہٹ لبوں پر سجائی مگر میرے چہرے کے تاثر نے اس کی مسکراہٹ کو بجھا ڈالا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ "کوئی دشواری؟"

"نہیں۔ لیکن میرا آج رات تم سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر سختی ابھر آئی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ اس کا حلیف ہونے ہی میں عافیت ہے۔ وہ اپنے حریفوں کے لئے یقیناً بہت سخت آدمی تھا۔ خدا کا شکر کہ میں اس کی حلیف ہی تھی۔

"کہو...... کیا بات ہے؟"

میں نے اپنی بات مدلل انداز میں مرتب کی تھی۔ میں معقولیت سے بات کرنا چاہتی

تھی۔ مگر اس کے جارحانہ تیوروں کے سامنے ہر تیاری دھری رہ گئی۔ میں نے بے بس عورتوں کی طرح کہنا شروع کیا۔ "دیکھو جہانگیر...... یہ بات نہیں بن سکتی۔ ہم نے اس منصوبے کو قابلِ عمل سمجھ کر بنیادی غلطی کی ہے۔ اب ہمیں دادا جی کے سامنے کوئی بات بنانا ہو گی۔ میرے مزید یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سمجھ رہے ہو نا؟ اگر میں کامیاب ہو بھی گئی ہوتی، تب بھی......"

"ہو بھی گئی ہوتی؟" اس نے سخت لہجے میں دہرایا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ خان بابا کو تمہارے جعلی ہونے کا علم ہو چکا ہے؟"

"نہیں...... نہیں...... دیکھو جہانگیر، مجھے افسوس ہے کہ......"

"اوہ...... ضمیر کی خلش کا چکر ہے لیکن ثمینہ، تمہیں بہت دیر میں ضمیر یاد آیا۔ اب واپسی کا ہر دروازہ بند ہو چکا ہے۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

اس کے لہجے نے مجھے دلیر بنا دیا۔ "جہانگیر خان...... کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں جاناں۔ میں یہ یاد دلا رہا ہوں کہ ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پایا ہے اور تم اتنی جلدی پیچھے نہیں ہٹ سکتیں۔ سب کچھ میری توقع سے بہتر انداز میں ہوا ہے۔ اب تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ تم اپنے مقصد کے حصول کے لئے کتنا آگے جا سکتے ہو۔"

"یہ تو کبھی کبھی میں خود بھی سوچتا ہوں۔" اس نے پُرلطف لہجے میں کہا۔ "آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اپنے دو ہاتھوں سے کیا کیا کر سکتا ہے۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں فارم سے محرومی ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ خواہ اس کے لئے مجھے غلط طریقے اختیار کرنے پڑیں۔" اچانک اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "تم اپنی سناؤ۔ کیا گھوڑی نے تمہیں بہت زیادہ ڈرا دیا؟"

"یہ بات نہیں جہانگیر۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ دادا جی سے گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہوا ہے کہ صورتِ حال ویسی ہرگز نہیں، جیسی تم سمجھ رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دادا جی ہر حال میں فارم تمہارے نام چھوڑیں گے۔"

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو!" اس کی حیرت دیدنی تھی۔

"خدا کی قسم' یہ سچ ہے۔ دادا جی نے جمعے کو وکیل کو بلوایا ہے۔ تمہیں یہ بات نہیں معلوم؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ سحرزدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ "کچھ بھی ہو۔ یہ محض تمہارا اندازہ ہے۔ بڈھے نے کھل کر تو نہیں کہی یہ بات۔"

"انہوں نے مجھے بتایا کہ پہلے وہ سب کچھ میرے نام کرنا چاہتے تھے۔ پھر انہوں نے تمہاری تعریفیں شروع کیں۔ وہ تمہاری محنت کو دل سے سراہتے ہیں جہانگیر۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ آٹھ سال بعد اچانک واپس آ کر میں یہ توقع نہ رکھوں کہ وہ تمہیں نظرانداز کر کے سب کچھ مجھے سونپ دیں گے۔ جبکہ اس فارم کو بنایا سنوارا تم نے ہے۔"

"واقعی؟ انہوں نے یہ کہا؟" جہانگیر نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔ پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے مناسب یہی سمجھا کہ کہہ دوں' مجھے ایسی کوئی توقع نہیں ہے۔"

"ایک بات بتاؤں؟" جہانگیر نے آہستہ سے کہا۔ "تم روشنا سے اچھی.......... بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"یہ بات کیسے کہہ رہے ہو تم؟"

"اس لئے کہ تم خلوص دل سے چاہتی ہو کہ فارم مجھے مل جائے۔ اس میں میرے وعدوں کے لالچ کا کوئی دخل نہیں۔"

"حالانکہ ایسی بات نہیں۔ میں تو کرائے کے فوجی کی حیثیت سے تمہاری جنگ لڑ رہی ہوں۔" میں نے چہک کر کہا۔

اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ "کیسی عجیب بات ہے۔" اس نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ "ہم نے کس طرح سازش تیار کی۔ تمہیں روشنا بنا کر یہاں لائے۔ حالانکہ اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو بڑے میاں ویسے ہی فارم میرے نام چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بہرحال' صغریٰ کو آنے دو۔ ابھی کوئی بات حتمی نہیں۔ ویسے تم میری خوش قسمتی کا ستارہ ثابت ہوئی ہو۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں تم سے کیا کہنے آئی ہوں۔ ناراض نہ ہونا۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اب یہاں میری ضرورت نہیں۔"

"پاگل ہوئی ہو۔" اس کا لہجہ پھر سخت اور معاندانہ ہو گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بڑے میاں کیا سوچیں گے۔ سچ ہم بتا نہیں سکتے اور کوئی عذر کہاں سے

لائیں گے؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ میں دادا جی کے پاس جاؤں گی اور انہیں بتاؤں گی کہ میں فقط ایک نظر انہیں دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ اب جہانگیر کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ میں نے واپس آ کر غلطی کی ہے۔ وہ یہ عذر قبول کر لیں گے بلکہ ممکن ہے یہ سوچیں کہ میں ان کے فارم تمہیں سونپنے کے فیصلے پر کُڑھ رہی ہوں۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ ابھی یہ بات یقینی کہاں ہے کہ وہ فارم واقعی میری نام چھوڑیں گے اور پھر میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں کچھ بھی نہ دیں۔ البتہ تمہارے چلے جانے کی صورت میں وہ یقیناً تمہیں کچھ بھی نہیں دیں گے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"اے باضمیر لڑکی' میں نقد رقم دو میں نہیں' تین افراد میں تقسیم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔" جہانگیر نے جواب دیا۔ "اس صورت میں مجھے بھی اپنا حصہ ملے گا اور روشنا کو بھی.......... اس لئے تمہارا ٹھہرنا ضروری ہے سمجھیں؟"

"نہیں۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ وہ بڑی سنگین خاموشی تھی۔ مجھے خوف آنے لگا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ جہانگیر اندر ہی اندر کھول رہا ہو گا۔ بالآخر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"تو تم جانا چاہتی ہو۔ تمہاری مرضی۔ جو جی چاہے کرو۔ تم آزاد ہو۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟" میں نے پوچھا۔ "تم دادا جی کے فیصلے پر انحصار کرو گے۔"

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔" اس کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔ "ہم ابھی خان بابا کے پاس چلتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ تم روشنا نہیں بلکہ کراچی کی ثمینہ ہو' جو جرم کی راہ پر قدم رکھ چکی ہے۔ ہم انہیں بتائیں گے کہ تم نے' میں نے اور کلثوم نے' جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں' انہیں بے وقوف بنانے کے لئے یہ سازش تیار کی تھی۔ ہم نے ان کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ سمجھ رہی ہو؟"

"ہاں۔ سمجھ رہی ہوں۔ یہ انکشاف تو ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو گا۔"

"یقیناً۔ وہ اس جذباتی صدمے سے جاں بر نہیں ہو سکیں گے اور ہم انہیں مارنا نہیں چاہتے۔ یا چاہتے ہیں؟"

"جہانگیر!" میں نے احتجاج کیا۔

"پریشان نہ ہو جاناں، ہم ایسا نہیں کریں گے۔ میں تو صرف تمہیں صورتِ حال کی سنگینی کا اور خوف ناک نتائج کا احساس دلانا چاہتا تھا۔"

"یوں کہو کہ مجھے ڈرانا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی سمجھ لو کہ میں اس حقیقت سے واقف ہوں، تم نے ایک بار روشنا کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں کہہ گئی۔

"بہت خوب۔ یہ نتیجہ اخذ کر ہی لیا ہے تو اس پر یقین بھی رکھنا۔ اس طرح تم پٹڑی سے اترنے سے باز رہو گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

☆======☆======☆

صغریٰ بدھ کی سہ پہر آئی۔ اس وقت فضا میں بھُوسے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ گلابوں پر شہد کی مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں کلثوم کے ساتھ بیٹھی تھی کہ باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کلثوم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "یہ یقیناً صغریٰ ہو گی۔" کلثوم نے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں جا کر اُسے لاتی ہوں۔"

میں بھی کلثوم کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی۔ کلثوم باہر چلی گئی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی رہی۔

صغریٰ نے اترتے ہی کلثوم پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "کیسی ہو کلثوم بی بی؟ دادا جی کیسے ہیں؟ باجی آ گئیں؟ میں راشد کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ جیپ راشد کی ہے۔ بتاؤ نا' باجی آ گئیں نا؟"

میں اسے بغور دیکھتی رہی۔ وہ لڑکپن اور جوانی کے درمیان جھولا جھولتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے انداز میں بے حد کھلنڈرا پن تھا۔ پھر میں نے کار سے ایک جوان مرد کو اترتے دیکھا۔ وہ شاید راشد تھا۔ میں راشد کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے کار کا دروازہ بند کیا۔ اس دوران صغریٰ کلثوم کو اس کے متعلق بتاتی رہی۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ اس کے اطوار میں شائستگی تھی اور انداز میں اعتماد۔

"کلثوم! راشد ماہرِ ارضیات ہے۔ اس علاقے میں پتھروں کے متعلق تحقیق کی غرض سے آیا ہے۔" صغریٰ کلثوم کو بتا رہی تھی۔ "مگر یہ باتیں تمہاری سمجھ میں کہاں آئیں گی۔ میری سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مجھے تو پتھروں سے سر پھوڑنا اچھا نہیں لگتا۔"

کلثوم نے بڑی خوش اخلاقی سے راشد کو خوش آمدید کہا۔ "آپ کو زحمت ہو گی۔ میں صغریٰ سے کہتا آ رہا ہوں کہ میں کیمپ سائٹ میں ہی ٹھہر جاؤں گا۔ مگر یہ مانتی ہی

نہیں۔"

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہاں مہمانوں کی آمد کو باعثِ رحمت سمجھا جاتا ہے۔" کلثوم نے کہا۔ "ویسے تمہارا جانا ضروری ہے تو اور بات ہے۔ بہرحال' کم از کم چائے تک ضرور رکنا۔"

"کیا فضول بات ہے۔ میں تمہارا کیمپ دیکھ چکی ہوں۔ اس سے تو ہمارا اصطبل بہتر ہے۔" صغریٰ نے تیز لہجے میں راشد سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو گے۔" پھر وہ کلثوم کی طرف مڑی۔ "اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ باجی کہاں ہیں؟" اس کے لہجے میں تڑپ تھی۔

میں دروازے کی اوٹ سے نکلی اور صحن میں چلی آئی۔ صغریٰ کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں بلاوا بھی تھا اور کچھ اور بھی جسے میں کوئی مفہوم نہ پہنا سکی۔ شاید وہ نفرت تھی اور میں تھی بھی اسی قابل لیکن پھر تعطل کا وہ لمحہ سمٹ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "باجی' باجی.......... باجی.........." وہ ہنس بھی رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ "باجی......... تم بہت بری ہو۔ تم نے ہمیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ ان آنسوؤں پر نہ جانا باجی۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم زندہ ہو باجی۔ لیکن منہ سے کچھ تو بولو۔ تم بھوت تو نہیں ہو۔ بولو نا۔" اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

میں خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ محبت کے اتنے تند مظاہرے کے بعد میں کیا کر سکتی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی۔ "تم......... تم تو بڑی ہو گئی ہو صغریٰ۔"

"یہ تو ہونا ہی تھا۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

ہم دونوں ہنس دیئے۔ ہماری ہنسی بلند آہنگ تھی۔ میں نے کلثوم کی طرف دیکھا۔ وہ بہت بے زار لگ رہی تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر صغریٰ ہی نے میری سوچوں کو لفظوں کا پیراہن دیا۔ "کتنی عجیب بات ہے باجی۔ آدمی کسی کو دیکھنے' ملنے کی تڑپ میں پاگل ہو جاتا ہے اور جب ملاقات ہوتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جائے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔" میں نے کہا اور راشد کی طرف متوجہ ہوئی' جو اس طرح نظرانداز کئے جانے پر خجالت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس کی مزاج پرسی کی۔ پھر صغریٰ سے کہا۔ "چلو......... اندر چلیں۔"

ہم اندر چل دیئے۔ "باجی........... آپ بہت بدل گئی ہیں۔ کتنی دبلی ہو گئی ہیں اور جب آپ مسکراتی نہیں ہیں تو بہت ناخوش لگتی ہیں۔" راستے میں صغریٰ نے کہا۔ "آپ ایسی تو نہیں تھیں۔"

"تم میری اتنی پروا کیوں کرتی ہو گڑیا۔ یہ نہ بھولو کہ میں تمہیں چھوڑ کر چپکے سے چلی گئی تھی اور میں نے آٹھ برس تک تمہاری خبر تک نہیں لی۔"

"میں آپ کی پروا کرنے پر مجبور ہوں باجی' اس لئے کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ اتنی کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" صغریٰ نے بڑی سادگی اور سچائی سے کہا۔

☆======☆======☆

ایک اعتبار سے صغریٰ کی آمد بھی میری آمد جیسی ہی تھی۔ زینب نے اسے لتاڑ کر رکھ دیا مگر اس کی ڈانٹ میں بلا کی شفقت اور محبت تھی۔ صغریٰ اس کی عادی تھی لہٰذا ہنستی رہی۔

زینب نے میز پر چائے دانی اور کھانے کے کچھ لوازمات لا کر رکھے ہی تھے کہ جہانگیر آ گیا۔ اس کی آمد خلافِ توقع تھی........... وہ راشد سے بڑی گرم جوشی سے ملا مگر اس کا تجسّس مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔ شاید وہ تجزیہ کر رہا تھا کہ یہ نووارد اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ تو ثابت نہیں ہو گا۔ پھر اس کے چہرے پر نظر آنے والے اطمینان سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے اپنے خدشے ذہن سے جھٹک دیئے ہیں۔

اسی وقت دادا جی کمرے میں آ گئے۔ صغریٰ کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ صغریٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "دادا جی........... کیسے ہیں آپ؟" اس نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ خوب منہ دیکھے کی محبت ہے تمہاری۔ بارہ مہینے بعد صورت دکھائی ہے تم نے۔" دادا جی نے شکایت کی۔

"بارہ تو نہیں' دس مہینے ہوئے ہیں دادا جی۔ میں ایک ایک دن گنتی ہوں۔" صغریٰ نے کہا۔ پھر اس نے راشد کا دادا جی سے تعاف کرایا۔ پہلی بار پتا چلا کہ راشد کا تعلق صغریٰ کی ننھیال سے ہے۔

"اچھا کیا' جو انہیں لے آئیں۔" دادا جی نے کہا۔ پھر وہ راشد سے اس کے کام کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہے۔ جہانگیر اس دوران صغریٰ سے باتیں کر رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اس کے کان راشد کی باتوں پر لگے ہیں۔

زینب مزید چائے لے کر آئی تو اس نے بتایا کہ صغریٰ کا فون ہے۔ "وہ تمہارا

دوست ہے' بے چین ہو رہا ہے تمہارے لئے۔" زینب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

صغریٰ کے رخسار گلابی ہو گئے۔ "میرا دوست؟ کون دوست؟"

"وہی بشیر........... اور کون نذیر زمیندار کا بیٹا۔"

"کیا مطلب یہ کیسی گفتگو ہو رہی ہے؟" دادا جی چونکے۔

"پتا نہیں۔" صغریٰ نے بے پروائی سے کہا۔ "کیا بشیر فون پر مجھے بلا رہا ہے؟"

"ہاں۔ اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔" زینب نے تہدیدی لہجے میں کہا۔ "اگر مجھ سے پوچھو تو..........."

"پلیز زینب بی بی۔" صغریٰ نے اس کی بات کاٹ دی۔ اب اس کا چہرہ بری طرح تمتما رہا تھا۔ پھر وہ معذرت کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"بشیر اچھا لڑکا ہے۔ مگر صغریٰ کا اور اس کا مزاج بہت مختلف ہے۔" زینب نے راشد کو پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بھی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

ہم باتوں میں مصروف تھے کہ صغریٰ واپس آ گئی۔ اُس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی اور بے پروائی تھی۔ دادا جی نے پوچھا۔ "کیا بات تھی صغریٰ؟"

"کچھ بھی نہیں دادا جی۔ بس وہ میری خیریت دریافت کر رہا تھا۔"

"چلو چھوڑو۔ اب میرے پاس بیٹھو۔ میں تمہیں ڈھنگ سے دیکھ تو لوں۔" دادا جی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی گفتگو شروع ہو گئی۔ جہانگیر کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

چائے کے فوراً بعد راشد رخصت ہو گیا۔ میں صغریٰ کے ساتھ باہر نکل آئی۔ ہم کچھ دیر باغیچے میں ٹہلتے رہے۔ پھر چوبی پھاٹک کھول کر دریا کی طرف چل دیئے۔ اب ہم اگرچہ تنہا تھے' پھر بھی لگتا تھا کہ ہمارے پاس گفتگو کے لئے موضوع نہیں ہے۔ صغریٰ کے انداز اور باتوں سے اب تک کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے لگتا کہ وہ میرے حوالے سے اپنے مستقبل کے لئے کوئی خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے' یہ خیال اس کے ذہن کو چھو کر بھی نہیں گزرا ہو گا۔

ہم دونوں گزشتہ آٹھ برس کے خلاء کو بھرنے میں مصروف تھے۔ میں اسے اپنی شہری زندگی کے حقیقی واقعات سنا رہی تھی' وہ اپنی تعلیم کے متعلق بتا رہی تھی۔

"سچ' میں تو بہت بور ہوتی ہوں پڑھائی سے۔" اس نے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آ سکتا تمہاری اس بات پر۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے

تمہارا راشد مجھے بہت اچھا لگا ہے۔"

اس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ "سچ باجی۔ راشد ہے ہی ایسا۔ کوئی اسے پسند کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔" اس کی لہجے میں اچانک ہچکچاہٹ در آئی۔ "مجھے بھی وہ اچھا لگا ہے۔"

"تو اس میں قباحت کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلتا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے .... جیسے میر زندگی سے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری اس سے شادی ہو جائے لیکن کبھی کبھی.........." وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ "ویسے مجھے اس کے دل کی کوئی خبر نہیں۔"

میں مسکرا دی۔ "تم تین ہفتے یہاں قیام کرو گی۔ میرا خیال ہے' یہ مدت کار آمد ثابت ہو گی۔"

"ہاں۔" وہ بھی مسکرا دی۔ اس کے رخساروں پر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ پھر اس نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "باجی.......... ایسی باتیں کسی سے کی بھی تو نہیں جاسکتیں۔ اسی لئے تو میں آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ آپ مجھے صحیح مشورہ دے سکتی ہیں۔"

"گڑیا.......... تم نے یہ کیسے سوچ لیا۔" میں نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ "تم دیکھ چکی ہو' میں نے تو اس معاملے میں اپنی زندگی کو بھی تماشا بنا لیا تھا۔"

"اسی لئے تو.........." اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "اپنا وقت ہوتا ہے تو آدمی ناتجربے کار ہوتا ہے۔ ٹھوکریں کھا کر ہی تو دانش ملتی ہے۔ ہر شخص بیماری کی طرح دکھ اور اذیت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سر پر آپڑے تو سب کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ آدمی مثبت ہو تو دکھ سہہ کر مہربان بن جاتا ہے۔ ہے نا باجی؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ ویسے میرے خیال میں سخت دلی اور بے رحمی بدترین وصف ہیں۔ اس لحاظ سے نرم دلی اور مہربانی بہترین ہوئے۔ آدمی مہربان ہو تو اندر کی ہر کمی پوری ہو جاتی ہے۔"

وہ پھر ہچکچائی۔ لگتا تھا' کوئی اہم بات کرتے کرتے جھجک رہی ہے۔ میں نہ جانے کیوں نروس ہو گئی۔ "صغریٰ.......... مجھ سے اس بات کی وجہ نہ پوچھنا' بس مان لینا میری بات۔ فی الوقت اپنے اور راشد کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔"

صغریٰ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت پھیل رہی تھی۔ "کیوں باجی.......... آخر کیوں؟" اس کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

"میں وجہ نہیں بتا سکتی۔ بس تم پہلے راشد کے بارے میں اپنے جذبات کو تولو اور اس عرصے میں اگر کوئی اختلاف ہو تو اسے لوگوں پر عیاں نہ ہونے دو۔"

"لوگوں سے آپ کی مراد کوئی خاص شخص تو نہیں؟"

اس بار میں ہچکچائی۔ ایک لمحے کو تو ایسا لگا جیسے میں اسے ہر بات سچ سچ بتا دوں گی۔ پھر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "یہ سمجھ لو کہ میرا اشارہ دادا کی طرف ہے۔ وہ بیماری سے اٹھنے کے بعد کچھ خوف زدہ سے لگتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہم لوگوں کے مستقبل کی طرف سے فکر مند ہیں۔"

اس نے مجھے بغور دیکھا۔ اس لمحے وہ اپنی عمر سے بڑی اور سمجھ دار لگی۔ "آپ کا مطلب ہے' آپ کی آمد سے میرے مستقبل پر کوئی منفی اثر پڑ سکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ تم بڑے بوڑھوں کو سمجھتی ہونا۔ ان کے نزدیک اہم ترین چیز شادی ہوتی ہے۔ راشد انہیں پسند آیا ہے۔ وہ یقیناً تمہیں راشد سے وابستہ ہوتے دیکھنا چاہیں گے۔ میرا خیال ہے' راشد کو بھی وہ اچھے لگے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے باجی کہ دادا جی نے وکیل کو بلوایا ہے لیکن آپ اس سلسلے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مجھے زندگی اپنے انداز میں گزارنے کا موقع ملے۔ راشد کے خیالات بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے توقف کیا۔ پھر محبت آمیز لہجے میں بولی۔ "وعدہ کریں باجی' اب یہاں سے کبھی نہیں جائیں گی۔" میں خاموش رہی۔ اس نے بڑی نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میری خاموشی کو اقرار پر محمول کیا تھا۔ "وہ دیکھیں' آدم خان کی گھوڑی۔ لوگ کہتے ہیں' اس پر کبھی کوئی سواری نہیں کر سکے گا۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے' ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں اس کی ماں سے واقف ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"واقعی؟"

میں نے استعجابیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ گھوڑوں میں دلچسپی لینے والی تو نہیں لگتی تھی۔ چائے کی میز پر اس نے فارم کے معاملات میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور یہ بات دادا جی نے بھی محسوس کی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا' جیسے میری واپسی کی وجہ سے فارم سے اس کی جان چھوٹ گئی ہے۔ اس کی بے پروائی کی وجہ سے میرے ضمیر کا بوجھ بھی کم ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ اب جہانگیر اسے کبھی اپنے راستے کا

پتھر نہیں سمجھے گا۔

وہ گھوڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ گھوڑی چراگاہ میں چر رہی تھی۔ اس کی ہر حرکت کے ساتھ اس کے جسم کے عضلات پھڑکتے اور توانائی کا بھرپور احساس دلاتے۔ پھر گھوڑی نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور خیر مقدمی انداز میں ہنہنائی۔ دیر تک وہ ہمیں دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری طرف چلی آئے گی مگر پھر اس نے سر جھکا لیا اور دوبارہ چرنے میں مصروف ہو گئی۔ "میں سمجھی تھی کہ یہ اب ہماری طرف آئے گی۔" صغریٰ نے کہا۔ "آپ سے تو جانور بہت جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ آپ اسے سدھایئے۔ قاسم تو اسے خطرناک قرار دے چکا ہے۔"

"اچھی گھوڑی ہے یہ۔" میں نے کہا۔

"آپ اس سے بات کیوں نہیں کرتیں؟"

"نہیں۔ یہ وقت وحشی جانوروں کو رام کرنے کے لئے نامناسب ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آدم خان کو اپنے اصطبل کے لٹنے کا بہت ملال تھا۔" صغریٰ نے کہا اور ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔ پھر وہ گھوڑی پر نظریں جمائے جمائے بولی۔ "مجھ سے کچھ نہ چھپایئے۔ میں سب جانتی ہوں۔ زینب نے مجھے بتایا ہے کہ وہ واپس آگیا ہے۔ آپ کی ملاقات ہوئی اس سے؟"

زمین پر اترتے ہوئے..... جھٹپٹے میں وہ پورا منظر دھندلا گیا۔ "کیا مطلب؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"آدم خان کی۔" اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' وہ اس بچے کی طرح خفیف ہو گئی' جسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ "مجھے افسوس ہے باجی۔ مگر یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ میں ابتدا ہی سے سب کچھ جانتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اور آدم خان ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔"

"خدا کی پناہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میں شرمندہ ہوں باجی۔" اس نے محجوب لہجے میں کہا۔ "شاید مجھے آپ کو نہیں بتانا چاہئے تھا لیکن یہ ضروری تھا۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔"

"صغریٰ........ گڑیا۔"

"باجی........ یہ نہ سوچئے گا کہ میں آپ پر نظر رکھتی تھی۔ بات یہ ہے کہ لوگ دس گیارہ سال کی بچی کو اہمیت نہیں دیتے۔ خاص طور پر محبت کرنے والے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ حویلی کے دروازے والے آکاش بیل والے صنوبر کے درخت کے تنے میں خط چھپاتے تھے۔ مجھے اس وقت یہ سب بہت رومینٹک لگتا تھا مگر اب میں اذیت آشنا ہو چکی ہوں۔ آپ کا دکھ سمجھتی ہوں۔ آپ اس وقت اتنی ہی بڑی تو تھیں' جتنی اب میں ہوں۔"

"صغریٰ........ تم........ میں........ مجھے معلوم نہیں تھا۔" میں ہکلائی۔

"میں جانتی ہوں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آپ بہت ناخوش لگتی ہیں۔ کسی شادی شدہ مرد سے محبت بہت یاس انگیز ہوتی ہے۔ اب میں اس کا کرب سمجھ سکتی ہوں۔ ایسے میں فرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں سے کیوں چلی گئیں اور میرے نزدیک آپ بہت بہادر ہیں۔ پتا ہے' میں آپ کو یاد کر کے روتی تھی۔"

"کیا ضرورت تھی اس حماقت کی؟" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ ہنس دی۔ "یہ بات نہیں کہ اس وقت وہ میرے نزدیک کوئی المیہ تھا۔ مجھے تو وہ کوئی پریوں کی حسین کہانی لگتی تھی' اداس کر دینے والی' میٹھا میٹھا درد جگانے والی۔ میں بیٹھی سوچتی رہتی تھی کہ اس کہانی کو کوئی خوب صورت اختتام کیسے دوں' کیا اختتام دوں۔ باجی' کیا وہ سب کچھ آپ کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا؟"

"ہاں۔"

"آپ کو میری مداخلت بری تو نہیں لگی؟ آپ کہیں گی تو میں آئندہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کروں گی۔"

"اب کیا فرق پڑتا ہے۔ اب تو سب کچھ ختم ہو چکا۔"

وہ بھونچکی رہ گئی۔ "ختم ہو چکا؟ کیا مطلب؟"

"تم کیا سمجھتی ہو؟ آدمی ساری عمر تو کسی کے لئے آنسو نہیں بہا سکتا۔ بڑے سے بڑا زخم بھی مندمل ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔"

"لیکن........ لیکن........" وہ یک لخت مایوس نظر آنے لگی۔ "لیکن اب تو بات اور ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ........ کہ........" اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

"صرف اس لئے کہ زاریہ خانم مرچکی ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔

"جی.........جی ہاں۔" اس کے حلق سے بھنچی بھنچی آواز نکلی۔

مجھے ہنسی آگئی۔ "مجھے افسوس ہے۔ تمہارا سوچا ہوا خوش گوار اختتام پورا نہ ہو سکا۔ بھول جاؤ یہ سب کچھ۔"

"آپ یوں باتیں کر رہی ہیں' جیسے یہ کسی اور کی کہانی ہو۔"

"اب تو ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آؤ......... واپس چلیں۔ باتوں کے لئے تو بہت وقت پڑا ہے۔ پہلے کچھ آرام کر لو۔"

"ٹھیک ہے باجی۔" اس نے جماہی لی۔ "ارے......... مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

ہم دونوں گھر کی طرف چل دیئے.........

☆======☆======☆

میں صنوبر کے درخت کی توڑی ہوئی شاخ کے پاس کھڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی شاخ کی وجہ سے پیدا ہونے والا خلا اتنا نزدیک تھا کہ میں اسے ٹٹول سکتی تھی۔ میں نے درخت کے اس خلا میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نروس ہو رہی ہوں۔ یہ ایسا ہی تھا' جیسے کسی کی میز کی ذاتی دراز ٹٹولنا یا کسی کی ڈائری پڑھنا۔ وہ درخت دو محبت کرنے والوں کے جذبوں کا امین تھا اور میں .... میں محض ایک بھوت تھی۔ مجھے وہاں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

لیکن وہ مداخلت نہیں تھی۔ درخت کے خلا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس درخت نے ماضی میں بے شمار راز چھپائے ہوں گے۔ اس کی حیثیت خفیہ لیٹر بکس کی ہو گی مگر اب وہ محض ایک مردہ درخت تھا۔ میں وہاں سے ہٹ آئی اور رومال سے اپنے ہاتھ پونچھنے لگی۔

پھر میں نے جلی ہوئی حویلی پر نظر ڈالی۔ حویلی کا صدر دروازہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں صدر دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر تمام تر قوتِ ارادی صرف کر کے اپنے قدموں کو روکا لیکن رکنے کا کیا فائدہ تھا۔ کوئی اسرار مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا' مجھے بلا رہا تھا۔ میرے قدم خود کار انداز میں اٹھنے لگے۔

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ جلی ہوئی حویلی راکھ کا لبادہ اوڑھے کھڑی تھی۔ میں صندل کے اس درخت کی طرف بڑھ گئی' جسے خود رو گھاس نے گھیر لیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گھاس ہٹائی۔ پھر میں نے انگلی سے تنے پر کھدے ہوئے حروف ٹٹولے۔ چاندنی نے عبارت واضح کر دی تنے پر تحریر تھا۔ "وقت ہے' وقت تھا۔" میں نے اس سطر کے نیچے دیکھا۔ نیچے ایک اور سطر کندہ تھی۔ "وقت گزر گیا۔"

میں آہٹ سن کر ذرا نہیں چونکی۔ میں جانتی تھی کہ وہ آ گیا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ مجھے یوں بے یقینی سے گھور رہا تھا' جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔ اس کی سیاہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چاندنی میں وہ اور سیاہ لگ رہی تھیں۔ بالآخر اس نے سرگوشی میں کہا۔ "روشنا؟"

"آدم!" مجھے ایسا لگا جیسے یہ نام پہلی بار میری زبان سے ادا ہوا ہو۔

وہ آگے بڑھ آیا اور مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر رک گیا۔ کچھ دیر اذیت ناک خاموشی طاری رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "جیسے ہی مجھے پتا چلا' میں آ گیا۔"

"تمہیں امید تھی کہ میں تمہیں یہاں ملوں گی؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میرا خیال تھا۔ بس میں چلا آیا۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بہرحال آئے بغیر نہ رہ سکیں۔"

"ہاں مجھے......... مجھے تم سے ملنا تھا۔" میں نے کہا۔ میں اپنی اس بات پر اس کے ردِ عمل سے رہنمائی کی امید کر رہی تھی مگر اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔

"تم واپس کیوں آگئیں؟" اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔ اس کے انداز میں عدم دلچسپی تھی۔

"دادا جی بیمار ہیں۔ میں ان سے آخری بار ملنا چاہتی تھی۔"

"اوہ تم نے مجھے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔"

"مجھے علم نہیں تھا کہ تم یہاں ہو گے۔" میں نے بھی بے تاثر لہجہ اپنایا۔ "سچ تو یہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے مجھے علم نہیں تھا کہ......... کہ حویلی جل چکی ہے۔"

"تم کبھی سچ بولنے کی عادی نہیں رہیں۔ اس وقت کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں زاریہ کی موت کا علم نہیں تھا۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ مجھے یہ علم بھی نہیں۔ مجھے دلی افسوس ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے' اگر تمہیں علم ہوتا کہ زاریہ مر چکی ہے اور میں آزاد ہوں تب بھی تم واپس نہ آتیں؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مرحلہ آسان ثابت ہو رہا ہے یا دشوار۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے بھی پروا نہیں اور کیوں ہوتی؟ آٹھ سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ میں نے سکون کی سانس لی اور نرم لہجے میں کہا۔ "ہاں......... یہی بات ہے۔"

"سمجھا۔" پہلی بار اس کی پلکیں جھپکیں اور نگاہیں جھک گئیں۔ پھر اس نے جھٹکے

سے سر اٹھایا اور بولا۔ ”پھر بھی تم آج رات مجھ سے ملنے آ گئیں؟“

”ہاں۔ مجھے تم سے ملنا ہی تھا۔ مجھے تمہاری واپسی کی اطلاع مل گئی تھی۔ انتظار فضول تھا کیونکہ میں لوگوں کے ہجوم میں تمہارا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کر بھی نہ سکتی تھی۔“

”بڑی مہربانی تمہاری۔“

مرحلہ اب دشوار' بلکہ تکلیف دہ لگنے لگا تھا۔ میں اس ملاقات سے خوف زدہ اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ ناگزیر ہے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مجھ سے سوالات کرے گا' بر کا اظہار کرے گا' مجھ پر برسے گا لیکن اس کی خاموشی' بے نیازی' بے پروائی اور ٹک باندھ کر دیکھنا زیادہ اذیت ناک ثابت ہو رہا تھا۔

”اب میں جاؤں گی۔“ میں نے نروس ہو کر کہا۔

”تم یہاں سے کیوں گئی تھیں؟“

سوال اس قدر اچانک تھا اور لہجہ اس قدر نرم کہ میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ ”اس طرح تو کوئی نہیں جاتا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت کچھ ک تھا۔ تم یوں چپکے سے کیوں چلی گئیں؟“

”تم اس کی وجہ جانتے ہو۔“ میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”اب ان باتوں چھوڑو آدم۔ میں یہاں تم سے ملنے صرف اسی لئے آئی تھی۔ میرا خیال ہے' تمہار احساسات بھی مجھ سے مختلف نہیں.........“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تم سب کچھ بھول چکی ہو۔“ اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے آنسو روکنے کے لئے اپنے نچلے ہونٹ میں دانت گاڑ دیئے۔ ”تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں کبھی تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ اب تمہاری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے۔ ہے نا؟“ اس نے مزید کہا۔

”نہیں۔“ میرے منہ سے خود بہ خود انکار نکل گیا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”نہیں......... یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے۔“

”وقت انسان کو بدل دیتا ہے۔ تم بھی بدل گئی ہو......... بہت زیادہ۔“

”واقعی؟“ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ ”اب آ گئی ہو تو یہ بتاؤ' یہاں ٹھہرو گی نا......... اپنے دادا کے پاس؟“

یہ راستہ محفوظ تھا۔ چنانچہ میں نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ میں بلا توقف بولتی گئی۔

”میں نے کہا نا......... دادا جی کی بیماری کی خبر سن کر رہ نہیں سکی۔ میں صرف انہیں دیکھنے آئی ہوں۔ یہاں تمام لوگ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آئے ہیں۔ مجھے خوشی کہ میں واپس آ گئی۔ میں دادا جی کے ساتھ زندگی بھر رہنا چاہتی ہوں۔ دادا جی کے بعد میں یہاں نہیں رکوں گی۔“

”اور فارم کا کیا ہو گا؟“

”جہانگیر اسے سنبھال سکتا ہے۔“

”تم فارم جہانگیر کے قبضے میں جانے دو گی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”مجبوری ہے۔“

”میرے سوال کو غلط رخ مت دو۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ فارم تمہیں ملتا تو تم یہاں رک جاتیں یا نہیں؟“ اس نے جھنجلا کر کہا۔

”نہیں میں تب بھی نہیں رُکتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس فیصلے کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟“

”تم جانتے ہو کہ گہرا تعلق ہے۔“ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر وہ بولا۔ ”اس آخری رات میں نے جو کچھ کہا' جو کچھ کیا' اس پر آج تک پچھتا رہا ہوں۔ میرا پچھتاوا تمہارے پچھتاوے سے زیادہ شدید اور زیادہ تلخ ہے۔ شاید میں ساری عمر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا' صرف اپنے غصے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ میں نے بات کو اس حد تک کیوں پہنچنے دیا۔ اس وقت تم نو عمر تھیں۔ مجھے ہوش مندی اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا۔ زاریہ کے ساتھ تلخ ازدواجی زندگی تمہیں ایذا پہنچانے کا جواز ہرگز نہیں تھا۔“

”پلیز آدم! ایسی باتیں مت کرو۔ اس کی کوئی ضرورت.........“

”یہ نہ سمجھو کہ میں معذرت کر رہا ہوں۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے تم سے اپنے ساتھ بھاگ چلنے کی فرمائش کی۔ زبردستی تمہیں مجبور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنی معذور بیوی کا بھی خیال نہیں کیا۔ اتنا خود غرض بنا کہ سب کو بھول گیا اور تم نے......... تم نے مجھے ٹھکرا دیا......... انکار کر دیا۔“

”میں اور کیا کر سکتی تھی؟“

”میں نے تم سے کہا کہ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گی تو میں آئندہ تمہاری صورت دیکھنا

بھی پسند نہیں کروں گا۔ میں نے کہا کہ اس صورت میں یا تو تمہیں یہ علاقہ چھوڑنا ہو گا یا مجھے۔ لیکن روشنا.......... میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں سے جاؤ۔ خود میں زاریہ کی وجہ سے مجبور تھا۔"

"میرا جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے کہا نا' جو ہو چکا' اسے بھول جاؤ۔" میں نے کہا اور جانے کے لئے مڑی۔ وہ تیزی سے بڑھا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ میری گردن سے مس ہوا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی' اس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں میری بات سننا ہو گی۔ میں تم سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔"

میری سانسیں بے ربط ہو گئیں۔ میں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ "یہ ممکن نہیں۔" میں نے کہا۔

"خدایا۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ "مجھ سے ایسی کون سی خطا ہوئی ہے کہ تم مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی ہو۔"

"میں تم سے نفرت نہیں کرتی آدم.......... ہرگز نہیں۔"

"تو پھر کچھ دیر ٹھہر جاؤ اور میری بات سنو۔ روؤ مت روشنا۔ اِدھر دیکھو۔ تم نے مجھ سے کہا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ گویا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ میں نے مان لیا لیکن یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کروں۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے پوچھا۔ دور کوئی اُلو چیخا۔

"تمہاری محبت کے.......... تم سے ملنے کے سلسلے میں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرے لئے سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔" میرا جسم تن سا گیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں یہ قبول کر سکتا ہوں کہ تم نے ماضی کو پوری طرح بھلا دیا ہے لیکن جان مستقبل کو تو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ تم مجھ سے یہ توقع نہیں کر سکتیں کہ تمہارے واپس آنے کے باوجود میں کچھ نہیں کروں گا۔ محض تماشائی بنا رہوں گا۔" اس نے بڑی نرمی سے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ "اس بار میں آداب کے مطابق تمہیں پانے کی کوشش کروں گا۔ میں تمہارے دادا سے ملوں گا۔"

"نہیں۔" میں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ وہ حیران نظر آنے لگا۔ میں اس سے ملنے صرف اس لئے آئی تھی کہ میں آٹھ سال پرانے اس افسانۂ محبت کو جہانگیر سے چھپانا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ سیدھا سادا سچ مؤثر ثابت ہو گا۔ میں آدم کو بتاؤں

گی کہ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ میں مردہ ماضی کو دفن کر چکی ہوں۔ مجھے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ محبت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک بھی سکتی ہے۔ "پلیز آدم!" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "تم ہمارے گھر کبھی نہ آنا۔" پھر میرے سینے میں مچلتی ہوئی اذیت تند و تیز لفظوں کا روپ دھار گئی۔ میں بلا ارادہ بولتی گئی۔ "کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ تمہاری حویلی کی طرح میرے جذبے بھی جل کر خاک ہو چکے ہیں۔ اب کچھ نہیں رہا۔ مجھے تنہا چھوڑ دو.......... خدا کے لئے۔"

اس کے کندھے جھک گئے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر وہ بولا۔

"اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ یہ میرا پاگل پن کہلائے گا تو میں دعویٰ کرتا کہ تم روشنا نہیں ہو۔ آٹھ سال کم نہیں ہوتے۔ مگر اتنا طویل عرصہ بھی کسی کو اس طرح' اتنا نہیں بدل سکتا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ میرا حلق دُکھ رہا تھا۔ میں نے نسبتاً بلند آواز میں کہا۔

"کیسی احمقانہ بات ہے۔ میں روشنا نہیں تو پھر کون ہوں؟"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ پھر وہ تند لہجے میں بولا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم روشنا نہیں ہو؟"

میں ہچکچائی.......... اور ہچکچاہٹ کا وہ لمحہ جیسے برسوں پر پھیل گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری ہچکچاہٹ نے اس کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔

"تو تم روشنا نہیں ہو؟" اس بار اس کا لہجہ تند تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سکون سے سانس لے کر کہا۔ "نہیں.......... میں روشنا نہیں ہوں۔"

اس نے سر جھکا کر میرے چہرے کو بغور دیکھا۔ "تم بالکل اس جیسی ہو۔" اس نے کہا۔ "لیکن تمہاری آواز مختلف ہے۔ ایک اور بات بھی ہے مگر مجھ سے نہ پوچھنا۔ کوئی غیر معمولی بات ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' جس میں خوش دلی کا موہوم سا تاثر بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"اس سے کوئی فرق پڑ جائے گا؟"

"شاید نہیں لیکن میرے لئے اس بات کی اہمیت ہے کہ تم یہاں کیوں آئی ہو' روشنا بن کر۔ تمہیں مجھے سب کچھ یہ بتانا ہو گا۔ یہ میرا حق ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تم میرے معاملاتِ محبت کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ ورنہ آج رات اس طرح مجھ سے ملنے کیوں آتیں۔ تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا؟ روشنا نے؟" اس نے یاس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"روشنا نے؟" میں نے دہرایا۔

"اور کون بتا سکتا تھا؟" وہ صندل کے درخت کی طرف بڑھا اور گھاس ہٹا کر تنے پر کندہ لفظوں کو بڑی نرمی سے چھوا۔ "پلیز! مجھے روشنا کے متعلق بتاؤ۔"

"میں روشنا سے کبھی نہیں ملی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے یہ باتیں صغریٰ نے بتائی تھیں۔"

"صغریٰ؟"

"ہاں، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اس نے تمہیں روشنا سے چھپ چھپ کر ملتے، جنگل میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ وہ آکاش بیل والے صنوبر کے درخت کے پوسٹ بکس کے راز سے بھی واقف ہے۔ وہ اس وقت بچی تھی۔ اسے وہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے تمہارے اور روشنا کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔"

"اچھا.......... تو اس نے تمہیں یہ باتیں بتائی ہیں؟" وہ بولا۔ "ویسے تم نے اپنا کردار اتنی خوبصورتی سے ادا کیا ہے، مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہاری معلومات اتنی محدود ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی طرح جہانگیر کو ان باتوں کا علم ہو گیا.........."

"نہیں۔" میں نے کہا۔ میرا لہجہ اس قدر تند تھا کہ اس نے چونک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ "جہانگیر نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے تمہارا تذکرہ صرف ایک بار کیا تھا۔ درحقیقت میں بہت اچھی اداکارہ ہوں۔ میں نے اپنے طور پر نامکمل کڑیاں ملا کر زنجیر بنائی۔ یہ بھی یاد کرو کہ میں نے گفتگو کم کی ہے اور تم سے معلومات زیادہ حاصل کی ہیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ثمینہ۔"

"تم بالکل روشنا جیسی ہو۔ مگر یہ بات تو تم بھی جانتی ہو۔" اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہ تم روشنا بن کر زریاب خان کے گھر میں نقب لگا رہی ہو؟ کیوں؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "یہ تو تم سوچو۔ میں کیوں بتاؤں؟"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔ "کمال ہے! تم پشیمان بھی نہیں ہو۔ خاصی ڈھیٹ معلوم ہوتی ہو۔"

"کبھی تنگی رزق کا شکار ہو کر دیکھو تو پتا چلے گا کہ زندگی انسان سے کیا کیا کچھ کرواتی ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے چہرے پر غبار سا لہرا گیا۔ "ارے.......... میں تو بھول ہی گئی تھی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اب تو تم بھی محنت کرتے ہو رزق کے لئے۔ ایک بات بتاؤ۔ تمہیں اپنے ہاتھ خراب کرنا، لتھیڑنا اچھا لگتا ہے؟"

نہ جانے کیوں، وہ بری طرح چونکا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" اس نے کہا۔

"اگر بغیر کچھ کئے دولت کے حصول کا موقع ملے اور اس میں کسی کا **نقصان** بھی نہ ہو تو کیا تم اسے ٹھکرا دو گے؟"

"میں ایک بار ایسا کر چکا ہوں یہ حساب کون لگاتا ہے کہ کسی کا **نقصان** ہے یا نہیں اور حساب درست ثابت ہونا بھی ضروری نہیں۔ یہ بتاؤ، تمہاری پشت پناہی کون کر رہا ہے؟"

"جہانگیر خود.......... اور اس کی بہن۔"

وہ بڑی بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔ اس بات پر میں یقین نہیں کر سکتا۔ یہ تو جہانگیر کے لئے اپنے ہاتھوں اپنی گردن کاٹنے والی بات ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ دادا جی نے روشنا کو مردہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن انہیں حقیقت تسلیم کرنا ہی پڑتی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ صغریٰ کے نام بھی چھوڑ سکتے تھے اور جہانگیر کے نام بھی۔ کون جانے۔ ویسے میرا خیال ہے، وہ فارم جہانگیر ہی کو دیں گے۔"

"تمہیں کیا ملے گا اس فراڈ میں؟"

"وقتی طور پر ایک گھر، اس کے علاوہ ایک مستقل آمدنی۔"

"مستقل آمدنی؟ بس؟ جھوٹی لڑکی.......... تمہیں ترکے میں بہت کچھ ملے گا۔" وہ غرایا۔

"حقیقت پسندی سے کام لو آدم خان۔ جہانگیر یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ مجھے ترکے میں بہت کچھ ملے اور میرے پاس ہی رہے۔"

وہ خجل نظر آنے لگا۔ ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یعنی تمہیں جو کچھ ملے گا، تم جہانگیر کو سونپ دو گی۔ تمہیں ایک لگی بندھی آمدنی ملتی رہے گی۔ واہ، کیا منصوبہ بنایا ہے تین چوروں نے مل کر۔ ویسے تمہاری جہانگیر سے ملاقات کیسے ہو گئی؟"

"میں یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آئی تھی۔ ایک دن جہانگیر کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

وہ مجھے روشنا سمجھا۔ اس نے میرا پیچھا کیا۔ یوں اس سے میری گفتگو ہوئی۔" میں نے مختصراً بتایا۔

"یوں کہو کہ سازش تیار کی اور میرا خیال ہے' اب تک تم کامیاب رہی ہو۔ کیوں نہ ہوتیں۔ تمہارے اعصاب مضبوط ہیں۔ اندر کی معلومات تمہیں حاصل ہیں اور قسمت بھی تمہارا ساتھ دے رہی ہے۔"

"اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے کہ قسمت میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اب وہ مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حق بہ جانب تھا۔ مشابہت کی وجہ سے اس نے وہ راز فاش کر دیئے تھے' جن میں وہ عام حالات میں کبھی کسی کو شریک نہ کرتا۔ "تم چالاک ہو لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکو گی۔ ویسے میری آمد کا سن کے دھچکا تو لگا ہو گا۔ محبت کرنے والے یوں بیٹھے بٹھائے مل جائیں' ایسا عام زندگی میں کہاں ہوتا ہے۔ تم روشنا بن کر جاگیر حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ اب روشنا کے محبوب کا کیا کرو گی؟"

"مجھے واقعی دھچکا پہنچا تھا تمہاری آمد کا سن کر۔"

"لیکن تم نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔ تم نے مجھ سے ملاقات کا خطرہ بھی مول لیا۔ ظاہر ہے' تم لوگوں کے درمیان پہلی بار میرا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ بتاؤ' اب کیا ہو گا؟ مجھے تمہارے فریب کا پردہ چاک کرنے سے کون روک سکتا ہے؟"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ ممکن ہے' تم دادا جی کو حقیقت بتا دو۔ بتا دو کہ روشنا مر چکی ہے' بتا دو کہ جہانگیر اتنے عرصے سے فارم پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ ان کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "منحوس لڑکی........"

گزشتہ رات جہانگیر نے مجھے سکھا دیا تھا کہ یہ کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم سب کی بہتری کے لئے ان معاملات کو جوں کا توں رہنے دو گے۔"

"سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس سے کتنے لوگوں کو اذیت ہو گی۔ جھوٹ تو جھوٹ ہی رہتا ہے۔"

"تم مجھ پر جھوٹ کا حکم لگانے والے کون ہوتے ہو؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔ "میں جو کچھ کر رہی ہوں' غلط نہیں ہے۔ اس میں کسی کا نقصان نہیں۔"

وہ بری طرح چونکا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "کیوں' یہ سب کچھ صغریٰ کے لئے بہتر کیسے ہو سکتا ہے؟"

"صغریٰ کو دولت کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے چچا جان کی چھوڑی جائیداد کافی ہے۔" میں نے دلیل دی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ صغریٰ کی محرومی کو تو تم نہیں جھٹلا سکتیں اور پھر تم اور جہانگیر' بوڑھے زریاب خان کو فریب دے رہے ہو۔ میں اگر زبان بند رکھوں گا تو اس کی بقاء کی خاطر لیکن صغریٰ کی بات اور ہے۔ زریاب خان کے بعد........"

"کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ اگر دادا جی کا انتقال وصیت تبدیل کرنے سے پہلے ہو جاتا ہے اور اس دوران تم روشنا کو دوبارہ اس کی قبر میں دھکیل دیتے ہو تو اس صورت میں صغریٰ کا کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے' میں جہانگیر کو تم سے بہتر' تم سے زیادہ جانتی اور سمجھتی ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

ماحول پر سکوت چھا گیا۔ اس خاموشی میں مَیں اپنے دل کی دھڑکنیں تک صاف سن رہی تھی۔ شاید وہ بھی سن رہا ہو گا۔ "بے بنیاد بات ہے۔" اس نے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ پھر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"ظاہر ہے۔ میں ایک بات بتا دوں۔ میں فطرتاً بری نہیں ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ غلط کر رہی ہوں مگر اس سے کسی کو نقصان نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس میرا یہاں سے ہٹ جانا ضرر رساں ثابت ہو گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے آدم خان کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے روشنا ہی رہنے دو۔"

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "وقتی طور پر میں یہ بات مان لیتا ہوں لیکن تمہیں اپنی سمت درست رکھنا ہو گی۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "تو تم اس فریب کا پردہ چاک نہیں کرو گے؟"

"یوں سمجھ لو کہ میں اس سلسلے میں سوچتا رہوں گا اور تم پر نظروں رکھوں گا۔ میرا وعدہ ہے کہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں خبردار ضرور کر دوں گا۔"

"شب بخیر آدم۔" میں نے کہا اور پلٹ کر چل دی۔ خاصی دور جانے کے بعد مجھے اس کی سسکی نما شب بخیر سنائی دی۔ میں سر جھکائے گھر کی طرف بڑھتی رہی۔

☆======☆======☆

دن گزرتے رہے۔ آدم کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے عزائم سے بے خبری کے سبب میں نے اپنا رویہ نارمل رکھا۔ میں نے صغریٰ سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے بھی مجھ سے آدم کے موضوع پر کوئی بات نہیں چھیڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اور راشد کے درمیان کچھ تلخی ہو گئی ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صغریٰ' راشد سے محبت کرتی ہے مگر راشد بہت ریزرو اور رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔ صغریٰ جیسی لڑکی کے لئے اس حصار کو توڑنا یقیناً آسان نہیں تھا۔ راشد خود اظہار کا قائل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ صغریٰ الہڑ اور رومینٹک تھی۔ راشد کا رکھ رکھاؤ اور خاموش طبعی اسے طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کرتی ہو گی۔ وہ سوچتی ہو گی کہ راشد اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ اس کی خاموشی کو کھنچاؤ پر محمول کرتی ہو گی۔ میں دعا کرتی کہ راشد کی خاموشی ٹوٹ جائے۔ وہ اظہار کر بیٹھے۔ صغریٰ کی خوشی کے لئے یہ بہت ضروری تھا۔

اس عرصے میں راشد عموماً ہر شام کیمپ میں اپنا کام نمٹا کر ہمارے ہاں چلا آتا۔ ایک بار صغریٰ خود کیمپ سائٹ چلی گئی۔ اس شام راشد اسے چھوڑنے آیا تو میں نے اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ صغریٰ اس کے کام کے حوالے سے شریر لہجے میں چوٹیں کرتی رہی۔ وہ بڑے مزے سے بیٹھا سنتا اور محظوظ ہوتا رہا۔

"یقین کیجئے باجی' میں نے راشد کو سچ مچ کیچڑ سے کھیلتے دیکھا ہے۔" صغریٰ نے شوخی سے کہا۔

راشد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم اس کی اہمیت نہیں سمجھ سکتیں' تمہاری آمد مبارک ثابت ہوئی۔ آج ہمیں پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ یہاں سے کچھ دھاتوں کے ذخائر برآمد ہو سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر وہ اپنے کام کی تفصیل بتاتا رہا۔ ان دنوں وہ شاداب پور کے نواح میں کھدائی کر رہے تھے۔

پھر صغریٰ نے بتایا کہ جمعہ کو وہ اور راشد خان پور جا رہے ہیں۔ "لیکن جمعہ کو تو دعوت ہے یہاں۔" میں نے صغریٰ کو یاد دلایا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم شام تک واپس آ جائیں گے۔ مجھے کچھ خریداری کرنی ہے۔" صغریٰ نے بے پروائی سے کہا۔

دادا جی نے راشد کو بھی مدعو کر لیا۔ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد اس نے دعوت قبول کر لی۔

جمعے کو وکیل صاحب آ گئے۔ دادا جی نے انہیں اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ دس منٹ بعد زینب نے مجھے چائے کی ٹرے تھما دی کہ ان کے کمرے میں پہنچا دوں۔ زینے کے قریب صغریٰ کھڑی نظر آئی۔ وہ روانگی کے لئے تیار تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ اتنی جلدی تیار ہو گئیں تم؟" میں نے کہا۔

"پتا ہے باجی......... راشد نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کام میں مصروف ہے۔" صغریٰ نے برہمی سے کہا۔

"اوہ' یہ تو برا ہوا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ "اسے......... اسے میری کوئی پروا نہیں' اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں۔"

"نہیں گڑیا۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"اس کے محکمے کا ڈائریکٹر آ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے' ڈائریکٹر سے ملاقات ضروری ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بات تو معقول ہے اس کی۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر اسے معلوم تھا کہ میں اپ سیٹ ہوں گی۔ پھر بھی یہ بتاتے وقت اس کے لہجے میں ایسی بے نیازی تھی' جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اُسے میری کوئی پروا نہیں۔"

اس لمحے وہ مجھے بہت چھوٹی سی لگی۔ "یہ بات نہیں' اُسے تمہاری پروا ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" میں نے دلاسا دیا۔

"تو پھر وہ مجھے بتاتا کیوں نہیں یہ بات۔" اس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"وہ دعوت میں تو شریک ہو گا نا؟"

"کہہ رہا تھا' کوشش کروں گا۔ میں نے کہا' جو جی چاہے کرو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"صغریٰ.........!"

"نہیں باجی۔ یہ بات میں نے بڑی نرمی سے کہی تھی۔ ایسے نہیں' جیسے آپ سے کہی ہے۔ لفظ بھی یہ نہیں تھے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "اچھا باجی' اب میں چلتی ہوں۔ خریداری بہت اہم ہے۔ میں بشیر کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

میں اسے روکنا چاہتی تھی لیکن نہ روک سکی۔ وہ اس وقت یقیناً ضدی پن کا مظاہرہ کرتی۔ میں چائے کی ٹرے لے کر اوپر چلی گئی۔ دادا جی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں

نے دستک دی۔ دادا جی نے دروازہ کھولا۔ میں نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور پیالیوں میں چائے اُنڈیلی۔

"زینب اور گلاب کو بلا دو۔" دادا جی نے کرخت آواز میں کہا۔ "ان سے وصیت نامے پر انگوٹھے لگوانے ہیں۔"

میں نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کمرے سے نکل آئی۔ میں زینے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ دادا جی نے پکارا۔ "میری بچی!" میں نے پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ "میں نے تمہاری بات پر یقین کر کے فیصلہ کیا ہے۔" وہ بولے۔

میں نے اطمینان کا وہ تاثر ان سے چھپانے کی بھرپور کوشش کی، جس کی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی تھی۔ "مجھے خوشی ہے دادا جی۔ اسی میں سب کی بہتری ہے۔"

"اور صغریٰ؟"

"صغریٰ کو اس جگہ سے محبت ہے مگر وہ اسے سنبھال نہیں سکتی۔ اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔" میں نے جواب دیا۔

دادا جی نے قہقہہ لگایا۔ "اگر اس کی شادی بشیر سے ہو جائے تو تمہاری بات غلط ثابت ہو جائے گی۔"

"لیکن آپ جانتے ہیں کہ راشد کی جڑیں شہر میں ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں، اور راشد اچھا لڑکا ہے۔ البتہ میرا خیال ہے، مالی طور پر کمزور ہے۔"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"درست۔ ویسے میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ تمہاری اور جہانگیر کی جوڑی بے حد مناسب رہتی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔"

"دادا جی.......... میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔"

"یہاں آؤ۔" انہوں نے کہا۔ میں ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرے رخسار پر رکھ دیا۔ ان کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا اور سوکھے پتے کی طرح ہلکا پھلکا.......... "لاڈلی! جانتی ہو، تمہاری واپسی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ بیٹا جان! تم آج بھی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے ہٹ کر نہ سوچنا۔"

"میں شروع ہی سے کہتی رہی ہوں کہ آپ کبھی انصاف پسند نہیں رہے۔" میں

نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہارے اور صغریٰ کے لئے کچھ رقم چھوڑی ہے۔"

"دادا جی، میں.........."

"سب کچھ طے ہو چکا۔ تم کچھ بھی کہو، میں نے حتی الامکان انصاف سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ مکان، مویشی اور فارم جہانگیر کو ملے گا۔ تمہیں یا صغریٰ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"البتہ میں فارم کی تلافی ضرور کروں گا۔ کیونکہ فارم کے معاملے میں مَیں نے تمہارا حق مارا ہے۔"

"دادا جی! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نقد رقم کے میں نے تین حصّے کئے ہیں۔ صغریٰ کو اس کا حصہ فوری طور پر ملے گا۔ باقی دونوں حصّے ایک ٹرسٹ میں چلے جائیں گے۔ تمہیں اس کی آمدنی مستقل طور پر ملتی رہے گی۔" انھوں نے میری بات نظرانداز کر کے کہا۔ "میں تمہیں ہمیشہ خوش حال دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمام رقم نکل جانے کی وجہ سے فارم پر کوئی اثر پڑے۔ تمہارے بعد رقم خود بہ خود جہانگیر یا اس کے ورثاء کو مل جائے گی اور اگر جہانگیر بے اولاد مر جائے تو فارم اور سب کچھ تمہیں ملے گا۔ اگر تم جہانگیر سے شادی کر لو تو.........."

"دادا جی........"

"پوری بات سن لو۔ اس صورت میں تم فارم پر رہوگی اور تمہیں نقد رقم یک مشت مل جائے گی۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ مجھے دادا جی کے استقلال پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ فارم کے ساتھ رقم وابستہ کر کے مجھے جہانگیر سے شادی کی ترغیب دے رہے تھے۔ میں وصیت نامے کی تفصیل ذہن نشین کر رہی تھی۔ "لیکن نقد رقم کا ایک حصہ صغریٰ کو اور دو حصے مجھے مل جائیں گے۔ تو جہانگیر کا کیا بنے گا؟" میں نے نکتہ اٹھایا۔

"میں نے اس کے اور کلثوم کے لیے کچھ رقم چھوڑی ہے۔"

"لیکن دادا جی.........."

انھوں نے چڑچڑے پن سے میری بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں اور صغریٰ کو نظر

انداز کر کے فارم جہانگیر کو دے رہا ہوں، کیا یہ کم ہے؟ جہانگیر یقیناً فارم کو سنبھال لے گا۔ وہ محنتی ہے۔ کام سے نہیں ڈرتا اور پھر فارم کامیاب جا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ باتیں چھوڑیں۔ آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں اب چلی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انھوں نے بڑی محبت سے میرا سر تھپتھپایا۔ "اچھی لڑکی۔" انھوں نے کہا اور کمرے میں چلے گئے۔ میں نیچے چلی آئی۔

☆======☆======☆

کئی دن سے میں دیکھ رہی تھی کہ جہانگیر کھانے کی میز پر سب کے ساتھ نہیں ہوتا.......... وہ تاخیر سے کھانا کھانے کے لئے آتا۔ وکیل کی آمد کے بعد سے وہ واضح طور پر اعصابی کشیدگی کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ وہ دن بھر کھیتوں میں کام کی نگرانی کرتا۔ پھر بھوسے کے چبوترے لپواتا۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا۔ گرمیوں کا چل چلاؤ تھا۔

وکیل کے جانے کے بعد دادا جی آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ کلثوم، زینب کے ساتھ باورچی خانے میں دعوت کی تیاری کے سلسلے میں مصروف تھی۔ کلثوم نے مجھے کچھ ضروری شاپنگ کے لئے نصیر کوٹ جانے کو کہا۔ میں باورچی خانے میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی مگر اس نے منع کر دیا۔

مجھے خریداری میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ واپسی میں میں پہاڑی ڈھلان سے اُتر رہی تھی کہ مجھے راشد کی جیپ نظر آئی۔ راشد کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے جیپ روکی اور پھر ریورس کی۔ میں نے قریب پہنچ کر اسے سلام کیا۔ اس نے جواب دیا اور مسکرانے لگا۔ "کیسی ہیں آپ؟" اس نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم ہماری طرف ہی جا رہے ہو نا؟"

"اگر نہیں بھی جا رہا تھا تو اب جانا پڑے گا۔" اس نے سیاست دانوں کے سے انداز میں کہا۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ "ظاہر ہے۔ ورنہ ہم تمہارا انتظار کرتے رہ جاتے۔ چلو.......... صغریٰ کو تمہاری آمد کی بہت خوشی ہو گی۔ وہ مانسہرہ گئی ہوئی ہے مگر کھانے کے وقت تک واپس آ جائے گی۔"

"مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر۔ وہ شاپنگ سے تو محروم نہیں ہوئی۔ کس کے ساتھ گئی ہے وہ؟ جہانگیر کے؟"

"نہیں۔ بشیر کے ساتھ گئی ہے۔ تم تو بشیر سے شاید کبھی نہیں ملے۔"

"اس کا تذکرہ سنا ہے۔" راشد نے جواب دیا۔ "آپ اپنا سامان پچھلی سیٹ پر رکھیں اور بیٹھ جائیں۔" اس نے جیپ کا دروازہ کھول دیا۔

"شکریہ۔ اب کم از کم تمہاری دعوت میں شرکت یقینی ہو جائے گی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم دعوت سے پہلے ہی گھر پہنچ جائیں گے۔ تم بور تو نہیں ہو گے؟"

"میں کبھی آسانی سے بور نہیں ہوتا۔ ویسے میں بھی آپ ہی کی طرف جا رہا تھا لیکن میرا ارادہ تھا کہ پہلے آدم خان سے ملوں گا۔ ملاقات نہ ہوئی تو کم از کم حویلی ضرور دیکھوں گا۔"

"چلو۔ میں بھی چلوں گی لیکن حویلی میں تمہاری دلچسپی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی ماہرِ اراضیات کا وہاں کیا کام؟"

"ہے ایک دلچسپی کی بات۔ میرے خیال میں وہاں تانبا نکلنے کا امکان ہے۔" اس نے بتایا۔

میں خاموش رہی۔ اس نے جیپ حویلی جانے والے راستے پر ڈال دی۔ راستہ خطرناک تھا۔ وہ بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔ "تمہیں شہر میں رہنا اچھا لگتا ہے؟"

"جی ہاں، لیکن کبھی کبھار شہر سے دور جانے کو بھی جی چاہتا ہے۔"

"یعنی تم مستقل طور پر شہر سے دور نہیں رہ سکتے؟"

"آپ کا مطلب ہے، صغریٰ سے شادی کے بعد۔"

میں اس کی براہِ راست گفتگو پر حیران رہ گئی۔ میں فوری طور پر تو کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ "ہاں، میرا مطلب تو یہی تھا مگر شاید تمہارے نزدیک میں دخل در معقولات کر رہی.........."

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں شہر کا آدمی ہوں۔ میرے مطلب کا روزگار بھی شہر میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں میرا مضافات میں، خصوصاً پہاڑی علاقوں کی طرف آنا جانا رہتا ہے۔ آپ کا مطلب ہے، صغریٰ یہیں رہنا پسند کرے گی۔ ویسے مجھے اس کی گفتگو سے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ فارم سے اس کی شادی ہو چکی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتی۔" میں نے کہا۔ اس نے مجھے بغور دیکھا۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے کبھی صغریٰ سے مستقبل کے بارے میں بات بھی کی ہے؟"

"نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا' کیسے کروں۔" اس کے انداز میں بے بسی تھی۔ "یہ بات نہیں کہ مجھے اپنے جذبے پر کوئی شک ہے یا یقین میں کچھ کمی ہے لیکن صغریٰ بہت کم عمر ہے۔"

"اب زمانہ اور ہے۔ لڑکیاں کم عمری ہی میں بُرے بھلے کی تمیز کرنا سیکھ جاتی ہیں۔"

"واقعی؟" وہ ہچکچایا۔ "لیکن صغریٰ کے انداز سے پتا چلتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"سنو۔ تمہیں بشیر کے متعلق فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"بشیر کی بات نہیں' میرا اشارہ جہانگیر کی طرف ہے۔"

"جہانگیر؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میرا خیال ہے' وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔"

راشد کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے' جہانگیر کی شخصیت خواتین کے لئے بے حد سحر انگیز ہے۔ کوئی لڑکی اس کے سحر سے نہیں بچ سکتی۔"

"اس کی کشش سے مجھے انکار نہیں۔ مگر یہ بات نہ بھولو کہ صغریٰ یہیں پلی بڑھی ہے۔ اس کے نزدیک جہانگیر بھائی ہے اور وہ بھی ناپسندیدہ۔ دیکھو راشد! تم اسے چاہے مداخلت تصور کرو' میں تم سے یہ اصرار ضرور کروں گی کہ صغریٰ سے براہِ راست بات کر لو۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ "ضرور۔ مجھے ایسا کر کے خوشی ہو گی۔"

اس نے جیپ روک دی۔ باقی فاصلہ ہمیں پیدل طے کرنا تھا۔ "آیئے' اب باتیں کم اور راستے پر توجہ زیادہ۔ یہ ڈھلوان خطرناک ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "میری زندگی انہی راستوں پر چلتے گزری ہے۔ یہ راستے میرے قدموں سے مانوس ہیں۔"

ہم گگر پر چلتے رہے۔ نیچے دریا شور مچاتا' چٹانوں سے سر ٹکراتا بہہ رہا تھا۔ ہم حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔ کھوہ والے صنوبر کے درخت کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ جہاں دیوار چٹخی ہوئی تھی' اس نے وہاں زمین کی طرف اشارہ کیا۔ "کچھ نظر آیا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے نگاہوں پر زور دیا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا دکھا رہا ہے۔ کم از کم

مجھے تو وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے امربیل ایک طرف ہٹائی اور دیوار کی بنیاد کے نیچے والے سیاہی مائل پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اطراف کی زمینوں میں تانبا موجود ہے۔" اس نے پتھر کو ناخن سے کھرچ کر دیکھا۔ "یقیناً........ میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔"

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے آدم خان سے ملنا ہو گا۔" اس نے کہا۔ "آیئے' اندر چلیں۔ میں صرف چند منٹ لوں گا۔ پھر ہم آپ کے گھر چلیں گے۔"

ہم گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ راشد جیسے مجھے بھول ہی گیا تھا۔ وہ وسیع و عریض احاطے میں جا بہ جا زمین کو بغور دیکھتا پھرا۔ وہ پچھواڑے کی طرف بھی گیا۔ میں صندل کے درخت کے پاس کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔ ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔

ہم گھر پہنچے تو کلثوم کو منتظر پایا۔ اس کے لئے کچھ اور مصروفیات نکل آئی تھیں۔ اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں راشد کے ساتھ حویلی باغ جا کر کچھ سیب لے آؤں۔ سیبوں کی فرمائش وہ صنوبر خان سے پہلے ہی کر چکی تھی۔ پیسے بھی دے دیئے گئے تھے۔

میں راشد کو ساتھ لے کر نکل آئی۔ "جیپ کی ضرورت نہیں' میں ایک شارٹ کٹ جانتی ہوں۔" میں نے کہا۔

حویلی باغ حویلی ہی کا ایک حصہ تھا اور حویلی کی عقبی دیوار کے پیچھے واقع تھا۔ ہمیں باغ تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگے۔ باغ بہت بڑا تھا۔ ایک حصے میں خوبانیوں کے' دوسرے میں آلوچوں کے اور تیسرے میں سیب کے درخت تھے۔ ہم درختوں کے درمیان قدم اٹھاتے باغ کے رکھوالے کی جھونپڑی کی طرف بڑھتے رہے۔ اچانک مجھے ایک خالی قطعہ زمین میں ایک شخص کام کرتا نظر آیا۔ وہ تھانولے بنا بنا کر ان میں سیب کے چھوٹے پودے لگا رہا تھا۔ اُسے ہمارے قریب پہنچنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

"صنوبر!" میں نے قریب پہنچ کر اُسے پکارا۔

"وہ تو.........." اس نے اٹھتے ہوئے کہا مگر اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔

"تم؟" مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ آدم خان تھا' جس سے چند روز پہلے میں حویلی میں ملی تھی۔ اب دن کی روشنی میں اُسے دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ میرے تصور سے کتنا مختلف ہے' کتنا بدل گیا ہے' اس کے کپڑے بوسیدہ تھے۔ ویسے کام میں

مصروف لوگ عموماً ایسے کپڑے ہی پہنتے ہیں۔ مگر بات صرف کپڑوں کی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر وقت نے بے شمار لکیریں کھینچ دی تھیں۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ، میں اس چاندنی رات میں نہیں دیکھ سکی تھی۔ مجھے اُس پر ترس آنے لگا۔ میں نے نظریں جھکالیں۔ وہ اس عالم میں میرے سامنے نہیں آنا چاہتا ہو گا۔ مجھے اپنا اس رات کا طنزیاد آیا۔ میں نے اُسے طعنہ دیا تھا کہ وہ زندگی کی سختیوں سے ناآشنا ہے۔ اب اسے دیکھ کر میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔

"صنوبر تو جاچکا ہے چھٹی کر کے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں سیب لینے آئی ہوں۔ مجھے کلثوم نے بھیجا ہے۔"

"ہاں۔ سیبوں کا ٹوکرا جھونپڑی میں رکھا ہے۔ چلو.......... میں دے دوں۔"

ہم جھونپڑی کی طرف چل دیئے۔ میری طرح وہ بھی متجسس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے بھی مجھ میں رونما ہونے والی تبدیلیاں پہلی بار نظر آئی تھیں۔ راشد پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ یہاں بھی زمین کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا۔ "تم صغریٰ کے ہونے والے شوہر سے ملے ہو؟ راشد نام ہے اس کا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کیوں؟"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ تم سے نجی نوعیت کی گفتگو کرنا چاہتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خطرہ؟" اس نے چونک کر کہا۔ "مجھے کس بات کا خطرہ ہو گا؟"

"تم شاید جہانگیر سے ملے ہوئے ہو کیونکہ تم دادا جی سے آکر نہیں ملے۔ تم نے میری پول نہیں کھولی۔"

اس نے پلٹ کر راشد کو دیکھا، جو زمین پر اکڑوں بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ "یہ ہے راشد؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تمہارے سوال کا جواب یہ ہے۔" اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "کہ مجھے زریاب خان کی زندگی عزیز ہے۔ اس کی خاطر میں نے تمہارے فراڈ کا پردہ رکھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے صرف صغریٰ کی فکر ہے، اور میرا خیال ہے، اس کے سلسلے میں مَیں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ صغریٰ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ تم جانو اور جہانگیر

جانے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں صغریٰ کے تحفظ کا خاص خیال رکھوں گی۔"

اس نے آہ بھر کے کہا۔ "مجھے یہ بات عجیب سی لگتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں قابلِ اعتبار سمجھتا ہوں۔"

ہم جھونپڑی تک پہنچ گئے تھے۔ جھونپڑی میں باہر کی نسبت ٹھنڈک تھی۔ دھوپ کے بعد اس سائے کی ٹھنڈک بے حد خوش گوار محسوس ہوئی۔ مجھے پھر آدم خان پر ترس آنے لگا، جو جاگیردار ہوتے ہوئے بھی محنت مزدوری پر مجبور ہو گیا تھا۔ سیبوں کا ٹوکرا جھونپڑی میں رکھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور مجھے چوری چوری دیکھتے پکڑ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ اس ایک لمحے میں اس کے چہرے سے گزرے برسوں کا غبار ڈھل گیا۔ باغ کے مزدور کی جگہ ایک محبت کرنے والے نے لی۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔

"پتا ہے، جب سے تم گئی ہو، کسی نے تمہارے باغیچے پر توجہ نہیں دی ہے۔" اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر مجھے دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "یہ تم لرزنے کیوں لگیں میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی؟"

"تم خوب جانتے ہو۔ تم دانستہ مجھے اعصاب زدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تم مجھے تباہ کئے دے رہی ہو۔" اس نے زیر لب کہا اور قدموں کی چاپ سن کر دروازے کی طرف مڑا۔ "یہ راشد صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے پلٹ کر راشد کو دیکھا، جو دروازے میں کھڑا تھا۔ پھر میں نے انہیں متعارف کرایا۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" راشد نے کہا۔ پھر اس نے حویلی کی زمین کی ملکیت کے بارے میں استفسار کیا۔ یوں پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ باغ اور دوسری زمین تو بِک گئی تھی مگر جلی ہوئی حویلی کا کوئی خریدار نہیں ملا تھا۔ وہ اب بھی آدم کی ملکیت تھی۔ راشد اسے تانبا نکلنے کے امکانات کے بارے میں بتاتا رہا۔ آدم بڑی دلچسپی سے سُن رہا تھا۔

"آپ مجھے کھدائی کی اجازت دیں گے؟" راشد نے پوچھا۔

"ضرور۔ مجھے اس کھنڈر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اس میں تو میرا فائدہ ہی ہے۔"

"حویلی میں تہہ خانے بھی ہیں؟" راشد نے پوچھا۔ آدم نے اثبات میں سر ہلایا۔
"آپ مجھے حویلی کا نقشہ فراہم کرسکتے ہیں؟"

"ہاں نقشہ تو مجھے زبانی یاد ہے۔" آدم نے ایک طرف رکھا ہوا کاغذ اور پنسل اٹھائی۔ پھر اس نے دستانے اتارے اور نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔

میرے لئے وہ لمحہ شاک کا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے دونوں ہاتھ بالکل سفید تھے اور جگہ جگہ ان پر سیاہ داغ تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ بری طرح جلے ہیں۔ "آدم!" میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ "یہ تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟" میرے لہجے میں اذیت تھی۔

"جل گئے تھے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

مجھے جہانگیر کی بات یاد آگئی۔ حویلی میں آگ لگی تھی۔ آگ زاریہ خانم کے کمرے سے شروع ہوئی تھی۔ آدم خان پہنچا تو زاریہ کا بستر شعلوں میں گھر چکا تھا۔ آدم جان پر کھیل کر اُسے بچا کر نیچے لایا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

اس نے جلدی جلدی نقشہ مکمل کیا اور دستانے پہن لئے اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے بے حد مہربان لہجے میں کہا۔ "سوری! مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے لوگ پہلی بار میرے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں۔"

"نہیں۔ میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ میں........... میں تو........... اب مجھے جانا ہے۔" مجھے احساس تھا کہ بے اختیار بہہ آنے والے آنسو میرے رخسار بھگو رہے ہیں۔ میں تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ "راشد پلیز! یہ ٹوکرا اٹھا لو۔" میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور جھونپڑی سے نکل آئی۔

☆======☆======☆

کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ صغریٰ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دادا جی کے کہنے پر کھانا لگا دیا گیا۔ کھانا خوش ذائقہ تھا مگر ماحول خاصا کشیدہ تھا۔ گزشتہ کئی روز کی دبی ہوئی کشیدگی ابھر آئی تھی۔ ادھر موسم کا مزاج بھی خراب تھا۔ گھٹا چھا گئی تھی اور گرج چمک کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

اس شام جہانگیر بھی خلافِ معمول جلدی آگیا تھا اور کھانے کی میز پر موجود تھا لیکن وہ بہت چپ چاپ تھا۔ اس کے چہرے پر اضافی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ البتہ دادا جی کی

آنکھوں میں شریر سی چمک تھی۔ انہیں ماحول کی کشیدگی کا اندازہ تھا اور یہ احساس بھی تھا کہ یہ ان کی حکمرانی کے لمحے ہیں۔ وہ ان سے محظوظ ہو رہے تھے۔

ماحول کی کشیدگی کو کھل کر سامنے آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا مگر پھر صغریٰ کی آمد میں غیر معمولی تاخیر اُسے سطح پر لے آئی۔ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ دادا جی میری طرف خصوصیت سے متوجہ تھے اور ان کی توجہ میں اس قدر محبت تھی کہ جہانگیر نے کئی بار پُر تشویش نظروں سے مجھے دیکھا جیسے شکایت کر رہا ہو۔ شاید اسے وصیت اور فارم کے بارے میں میری بتائی ہوئی بات غلط ثابت ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس سے نظریں چراتی رہی۔

کھانے کا مرحلہ بھی گزر گیا مگر صغریٰ نہیں آئی۔ "میں باہر جا کر معلوم کرتا ہوں۔ یہ تشویش ناک بات ہے۔" جہانگیر نے کہا اور باہر چلا گیا۔ زینب چائے لے آئی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے دادا جی کی پریشانی بھانپتے ہوئے انھیں تسلی دی۔ "دیر تو کسی بھی وجہ سے ہو سکتی ہے۔"

"لیکن روشنا........... دس بجنے والے ہیں۔" کلثوم نے کہا۔ میں نے پُر تشویش نگاہوں سے دادا جی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ وہ بہت بوڑھے لگ رہے تھے۔ چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

اسی وقت جہانگیر واپس آگیا۔ "کچھ پتا نہیں چل رہا۔" اس نے کشیدہ لہجے میں کہا۔ "میں چارہ کاٹنے جا رہا ہوں۔ ضرورت پڑے تو بلوا لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ اب میں خود بھی پریشان تھی اور اپنی پریشانی چھپا نہیں پا رہی تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر دادا جی اور پریشان ہو گئے۔ وہ بار بار کہتے۔ "کہاں رہ گئی بچی۔ خدا خیر کرے۔ کیا وہ فون بھی نہیں کر سکتی تھی؟"

بالآخر راشد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں اجازت چاہوں گا۔" اس نے دادا سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اور دادا جی نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ خیال ہی نہیں آیا۔

☆======☆======☆

میں نے برتن دھلوانے میں زینب کا ہاتھ بٹایا۔ کام سے فراغت کے بعد میں اور کلثوم بڑے کمرے میں آبیٹھے۔ دادا جی بھی وہیں بیٹھے تھے۔ اسی وقت باہر گاڑی رکنے اور پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر کچھ بلند آوازیں اور اس کے بعد صغریٰ

کے قدموں کی چاپ سنائی دی' چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ وہ زینے پر ہے۔

"صغریٰ!" دادا جی نے چیخ کر اسے پکارا۔

قدموں کی چاپ ٹھہر گئی۔ توقف......... دادا نے دوبارہ پکارا۔

چند منٹ بعد صغریٰ نمودار ہوئی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہچکچاتی رہی۔ اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ وہ بہت برہم لگ رہی تھی۔

"صغریٰ! کہاں رہ گئی تھیں تم؟" دادا جی کا لہجہ بہت سخت تھا۔ "میں سوچتے سوچتے پاگل ہو گیا۔ تمہیں تقریب کا بھی خیال نہیں تھا۔"

"دادا جی! میں شرمندہ ہوں۔ میں بھولی نہیں تھی اور وقت پر آ جاتی مگر ایک حادثہ ہو گیا تھا۔" صغریٰ نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ "کوئی زخمی تو نہیں ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟"

صغری نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں لیکن بشیر کی گاڑی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔" اس نے کہا۔ "پولیس نے الگ پریشان کیا۔ میں کیا کر سکتی تھی؟"

"ٹھیک ہے۔ اب کھانا کھا لو۔"

"تم فون کر سکتی تھیں۔" دادا جی نے تیز لہجے میں کہا۔ اُن کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

"جی ہاں۔ میں شرمندہ ہوں۔ پریشانی میں مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا۔" صغریٰ نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

"راشد آئے تھے۔" کلثوم نے صغریٰ کو بتایا۔ اس کے لہجے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ طنز کر رہی ہے یا اطلاع فراہم کر رہی ہے۔

صغریٰ دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ لگتا تھا' اب روئی اور تب روئی۔ "میں سمجھی تھی' وہ نہیں آئے گا۔" اس نے بہ مشکل کہا۔

اسی وقت کمرے کے دروازے میں جہانگیر نمودار ہوا۔ وہ بھی بہت غصے میں تھا۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ صغریٰ کے اور اس کے درمیان تلخ کلامی ہوئی ہے۔

صغریٰ نے اسے دیکھا تک نہیں۔ اس نے کلثوم سے پوچھا۔ "راشد کچھ کہہ رہا تھا؟"

"کس سلسلے میں؟" کلثوم نے جواباً سوال داغا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

دادا جی نے غصے سے کہا۔ "یہ راشد کا تذکرہ کہاں سے نکل آیا؟"

"جی ہاں......... غیر ضروری ہے۔" صغریٰ نے تند لہجے میں کہا۔ "اور مجھ سے جہانگیر کا استفسار بھی غیر ضروری تھا۔"

"جہانگیر؟ جہانگیر کا استفسار؟" جی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ جہانگیر کا خیال ہے کہ یہ اس جاگیر کا مالک ہے۔" صغریٰ نے بپھر کر کہا۔ "اس کا خیال ہے' میں اسے جواب دہ ہوں۔ اس نے بشیر کے سامنے مجھ سے بدتمیزی سے پوچھا کہ میں کہاں تھی۔ یہ سمجھتا ہے' اسے ہماری توہین کا حق حاصل ہو چکا ہے۔ یہی نہیں' اس کے بعد یہ بشیر پر بھی برس پڑا۔ خوب بُرا بھلا کہا اسے' جیسے وہ قصور وار ہو۔"

وہ اب جہانگیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "اگر وہ قصور وار تھا' تب بھی تمہیں اس سے اُلجھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بشیر بہت غصے میں تھا۔ مجھے اس سے معذرت کرنا پڑی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے جہانگیر۔ تمہیں بشیر سے نہیں اُلجھنا چاہئے تھا۔" دادا جی نے جہانگیر سے کہا۔

"بات یہ نہیں کہ وہ قصوروار نہین تھا۔ اگر میں قصور وار تھی' تب بھی جہانگیر مجھے ڈانٹنے والا کون ہوتا ہے۔ یہ میرے معاملات ہیں........."

"میرے بھی ہیں۔" دادا جی نے مزاحیہ انداز مین کہا مگران کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ مجھے ٹوک سکتے ہیں' جہانگیر نہیں ٹوک سکتا۔" صغریٰ کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "لیکن جہانگیر تو شروع ہی سے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کا عادی ہے۔ برسوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے' کسی نے کبھی نوٹس نہیں لیا لیکن میں اب بچّی نہیں ہوں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو گا۔ چاہے جہانگیر کو اس فارم کا اور اس مکان کا مالک بنا دیا جائے۔"

"صغریٰ!" میں نے صغریٰ کو ڈانٹا۔ "ایسی باتیں مت کرو۔" لیکن کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔

دادا جی نے اعتراض کیا۔ "اس آخری بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"صرف اتنا کہ یہ میرا گھر ہے جہانگیر کا نہیں اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کم از کم اب یہ ناممکن ہے........."

دادا اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بس......... تم بہت بول چکیں۔ اب مجھے بھی کچھ کہنے دو۔ تم یہ بھول رہی ہو کہ درحقیقت یہ گھر میرا ہے اور کان کھول کر سن لو۔ میں یہاں

امن و سکون دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بدتمیزی اور چیخ و پکار سخت ناپسند ہے۔ تم اور جہانگیر اگر جھگڑنا ضروری سمجھتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔ اب میں سونے جا رہا ہوں۔"

"دادا جی.........! مجھے معاف کر دیجئے دادا جی۔ میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔" صغریٰ سسکنے لگی۔ پھر وہ دروازے کی طرف لپکی اور کمرے سے نکل گئی۔

جہانگیر ساکت و صامت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے برہمی کا تاثر معدوم ہو چکا تھا۔ اب اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"اب تم یہاں سر جھکائے کیوں کھڑے ہو۔ کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟" دادا جی اس پر الٹ پڑے۔ وہ بغیر ایک لفظ کہے پلٹا اور باہر چلا گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دادا جی کے ہاتھ تھام لئے۔ "آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں دادا جی۔ ذرا سی بات تھی۔ صغریٰ اپنی تاخیر پر شرمندہ تھی۔ جہانگیر پر اِن دنوں کام کا بہت بوجھ ہے۔ ایسے میں جھڑپ ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ صبح دونوں ایک دوسرے سے معذرت کر لیں گے۔"

دادا جی نے مجھے بغور دیکھا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کاش! تم جہانگیر سے شادی کر لیتیں۔ اب میں سونے جا رہا ہوں۔ نیند آ رہی ہے مجھے۔"

ان کے جانے کے بعد کلثوم نے مجھے اور میں نے کلثوم کو بغور دیکھا۔ پھر کلثوم بولی۔

"مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

میں کمرے سے نکلی۔ مجھے جہانگیر کو تلاش کر کے اس سے بات کرنا تھی۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا سوئیٹر پہن رہا تھا۔ "جہانگیر.........! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "صغریٰ اور راشد کے درمیان کچھ تلخی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے صغریٰ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اس کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہ لینا۔"

"میرا تجربہ ہے لوگ چڑچڑے ہو جائیں تو صرف سچ بولتے ہیں۔ ہر نقاب اتر جاتی ہے چہرے سے۔"

"تم بلا وجہ پریشان ہو رہے ہو۔"

"پریشان؟" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھری۔ پھر وہ مسکرایا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "مجھے تو لطف آیا ہے، خوشی ہوئی ہے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ پہلے تو ایکسیڈنٹ ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ کھانے کے وقت پر نہیں پہنچ سکی اور پھر گھر میں ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں۔"

"تم اتنی وضاحتیں کیوں کر رہی ہو۔ مجھ سے کسی بات کا کوئی تعلق نہیں۔ اس گھر میں میری اور کلثوم کی حیثیت ملازموں کی سی ہے۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"پانی کھینچنے والی موٹر میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ اُسے ٹھیک کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے، صغریٰ کے نزدیک یہ میری ذمے داری ہو گی۔ وہ اسے مداخلت نہیں سمجھے گی۔"

"خدا کے لئے جہانگیر! بے کار کی باتیں.........."

"زخموں پر مرہم رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ مگر یقین کرو، میرے زخم زیادہ گہرے کبھی نہیں ہوتے؟"

"سنو جہانگیر! ویسے میں تمہیں نہیں بتاتی لیکن اس صورتِ حال میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

وہ دروازہ کھولتے کھولتے ٹھٹک گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ "کیا مطلب؟ صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ تمہارا گھر ہے۔ تم اس پر اپنا حق، اپنی اہمیت ثابت کر چکے ہو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہر غیر اہم بات نظر انداز کر دو۔"

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر ہو گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور میرے لئے یہ جاننا ضروری تھا۔ "اور نقدی کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تمہیں مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کیا تم نے وفاداری تبدیل کر لی ہے؟ تمہیں بڈھے خان سے اور صغریٰ سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔ تمہیں مجھ سے کچھ چھپانے کا کوئی حق نہیں۔"

اس کے لہجے میں دیوانگی تھی۔ میں سہم گئی۔ جانتی تھی کہ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ "نقدی میرے اور صغریٰ کے درمیان تقسیم ہو گی۔ صغریٰ کو تین میں سے ایک حصہ ملے گا فوری طور پر۔ دو حصے میرے ہوں گے، وہ میں تمہارے نام منتقل کر سکتی ہوں۔ ہم معاہدے پر پوری طرح عمل کریں گے۔ یاد رکھنا، صرف تم ہی مجھے

بلیک میل نہیں کر سکتے، میں بھی تمہیں بلیک میل کر سکتی ہوں۔"

"سوال یہ ہے کہ کیا صغریٰ وصیت کو چیلنج کرے گی؟" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ پھر خود ہی بولا۔ "کر سکتی ہے۔ اس کے دعوے کے لئے خاصی مضبوط بنیاد موجود ہو گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اسے فارم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہ درست ہے مگر وہ صرف مجھے یہاں سے بے دخل کرنے کے لئے ایسا کر سکتی ہے۔ خیر، دیکھا جائے گا۔" اس نے کہا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

میں چند لمحے دروازے پر کھڑی رہی۔ مجھے جہانگیر پر ترس آ رہا تھا۔ یہ میں نے اپنے لئے اضافی عذاب مول لے لیا تھا۔ بہرحال میں نے سر جھٹکا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ میں سوچ رہی تھی کی صغریٰ کو اپنے بارے میں کس حد تک حقیقت سے آگاہ کروں۔ یہ خاصا ٹیڑھا مسئلہ تھا اور ضروری بھی تھا۔ اُسے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جہانگیر کس حد تک آگے جا سکتا ہے۔ دوسری بات میری سمجھ میں یہ آئی کہ صغریٰ اگر راشد کی محبت کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو وہ فارم میں کوئی دلچسپی نہیں لے گی۔

میں نے صغریٰ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازے کی درز سے بھی روشنی جھانکتی نہیں دکھائی دے رہی تھی لیکن مجھے یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ سو چکی ہوگی، خصوصاً اتنی تلخی کے بعد۔ میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس بار بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں تیسری دستک کے لیے ہاتھ بڑھا ہی رہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کلثوم تھی۔

"وہ چلی گئی۔" کلثوم نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ میں حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ مسکرائی۔ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ بڑے میاں نے یہی کہا تھا نا۔ وہ بھاگ گئی۔" اس نے دروازہ دھکیلا اور کمرے میں روشنی کر دی۔ کمرا خالی پڑا تھا۔

"میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ وہ دریا کی طرف گئی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ "دریا کی طرف۔" میں بڑبڑائی۔ وہ ڈھلتے ہوئے چاند کی رات تھی۔ میں دریا کی سمت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ "کلثوم.......... تم مذاق کر رہی ہو۔ وہ اس طرح کیسے جا سکتی ہے۔ یہ ناممکن ہے!" میں نے ایک طرف ہٹ کر کپڑوں کی الماری کھولی۔ "دیکھ لو، اس کی تمام چیزیں

موجود ہیں۔"

"تب تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ واپس آجائے گی۔ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔" کلثوم بڑبڑائی۔

"لیکن وہ کہاں گئی ہوگی؟"

"خدا ہی جانے۔" اس کے لہجے میں بے زاری اور تھکن اتر آئی۔

"کاش.........! کاش وہ میرا انتظار کر لیتی۔"

"تم اس وقت دروازے پر جہانگیر سے بات کر رہی تھیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ یہ سمجھی کہ میں اس کے خلاف جہانگیر سے جوڑ توڑ کر رہی ہوں۔"

"تم جہانگیر سے کیا بات کر رہی تھیں؟"

"صغریٰ کی طرف سے اس سے معذرت کر رہی تھی۔"

"اچھا......... میں تو چلتی ہوں۔"

اب میں راہ داری میں اکیلی تھی۔ میں کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ غور سے دیکھنے پر بھی باغیچے میں نقل و حرکت نظر نہیں آئی۔ داہنی سمت دریا کا کنارہ تھا۔ اسی طرف موٹر روم تھا۔ موٹر روم میں روشنی تھی۔ شاید جہانگیر کام میں مصروف تھا۔ کلثوم کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ "تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔" میں بُری طرح چونکی۔ کوئی بات میرے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ صغریٰ چپکے سے نکلی ہو گی مگر ممکن ہے، دروازے پر کھڑے جہانگیر نے اُسے دیکھ لیا ہو۔ میرے تصور میں اندھیرے میں دریا کے اوپر خطرناک گگر پر دوڑتی ہوئی صغریٰ کا ہیولا اُبھر آیا۔

موٹر روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ موٹر کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

میں اچانک تیزی سے بھاگی۔ زیادہ وقت نہیں تھا۔ نیچے اتر کر میں نے دروازہ کھولا اور تاریکی میں نکل گئی۔ اس وقت میں معقولیت کی حدوں سے گزر گئی تھی۔ صرف جبلت میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں نے مدد کے لئے جہانگیر کو ساتھ لینے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ موٹر روم سے ایک کچا راستہ گگر کی طرف جاتا تھا۔ میں اس پر پاگلوں کی طرح بھاگتی رہی۔

تاریکی بہت دبیز تھی۔ گگر کے ایک جانب ایستادہ پُرانے بلند و بالا درخت تاریکی کے تاثر کو اور گہرا کر رہے تھے۔ "صغریٰ! صغریٰ.........." میں نے وحشت کے عالم میں چیخ کر

اُسے پکارا۔

پھر مجھے صغریٰ کی چیخ سنائی دی۔ چیخ زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں ایک لمحے بعد غور کر سکی کہ وہ چیخ گھٹی گھٹی سی تھی اور فوراً ہی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر اسے پکارا اور پکارتی گئی۔ اس دوران میرے قدموں کی رفتار سست نہیں پڑی تھی۔ آگے گھ اور دریا کے درمیان ایک چھوٹا سا مسطح قطعہ زمین حائل ہوتا تھا۔ میں وہاں پہنچ کر ٹھٹک گئی۔ صغریٰ قطعہ زمین کے دریا کے نزدیک والے حصے کے قریب گری ہوئی تھی۔ اس کے بال کھل گئے تھے۔ مدھم چاندنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی جہانگیر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے سہارا دے رہا ہو۔

"صغریٰ.........! نہیں.........!" میں نے چیخ کر کہا اور تیزی سے اس کی طرف دوڑی۔ اُسی لمحے درختوں کی اوٹ سے ایک سایہ تیز قدم اٹھاتا لپکا اور جہانگیر کے سنبھلنے سے پہلے اس کا کالر تھام کر اُسے پیچھے کھینچ لیا۔ جہانگیر کے منہ سے بے ساختہ گالی نکلی۔ سائے نے اسے جھاڑیوں میں اچھی طرح رگڑ ڈالا۔

میں ایک لمحے کو ٹھٹکی مگر پھر صغریٰ کی طرف لپکی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر سانس چل رہی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ بظاہر وہ کمزور بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ "آدم.........! خدا کا شکر ہے' یہ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

وہ ہانپ رہا تھا۔ شاید میری طرح اس نے بھی صغریٰ کی چیخ سنی ہو گی۔ وہ یقیناً مخالف سمت سے آیا تھا۔ "یہ ہو کیا رہا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میرے خیال میں کوئی خاص بات نہیں۔ تمہارا ردِ عمل خواہ مخواہ ہی شدید ہو گیا۔" میں نے کہا اور صغریٰ کو کسمساتے دیکھا۔ "یہ ہوش میں آ رہی ہے۔"

صغریٰ کی پلکیں متحرک ہوئیں اور چند لمحے بعد اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ "باجی......... آہ باجی.........!" وہ مجھے دیکھ کر سسکنے لگی۔

عقب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ صغریٰ خوف زدہ ہو گئی۔ "باجی......... جہانگیر.........!"

"سب ٹھیک ہو گیا ہے صغریٰ۔ آدم بھی یہاں موجود ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔" میں نے اُسے دلاسا دیا۔

صغریٰ نے بچوں کی طرح سرگوشی کی۔ "باجی.........! جہانگیر مجھے قتل کرنے وا

تھا۔"

پیچھے کھڑے ہوئے آدم خان نے گہری سانس لی۔ اسی لمحے جہانگیر نے بھاری آواز میں کہا۔ "آدم.........! یہ کیا حماقت تھی۔ پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

آدم نے نرم لہجے میں کہا۔ "تم نے سنا نہیں' صغریٰ کیا کہہ رہی ہے؟"

"میں نے سن لیا ہے۔" جہانگیر نے اپنے ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ خون آلود ہو گیا۔ اس نے تند لہجے میں کہا۔ "پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ میں اسے کیوں قتل کرنے لگا۔ ہوش میں تو ہو۔"

آدم اُسے گھورتا رہا' پھر بولا۔ "بنو مت۔ میں اس کی چیخ سن کر ہی اس کی طرف لپکا تھا۔ ذرا یہ تو بتاؤ' صغریٰ بے ہوش کیسے ہو گئی؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میں کیا بتاؤں۔ میں تو اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ یہ اچانک ہی گری اور بے ہوش ہو گئی۔"

صغریٰ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور چہرہ میرے کندھے میں چھپا لیا تھا۔ جہانگیر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم انہیں حقیقت کیوں نہیں بتاتیں۔" پھر وہ آدم کی طرف مڑا۔ "وجہ سے تمہیں غرض نہیں ہونی چاہئے۔ بہرحال آج میری اور صغریٰ کی لڑائی ہوئی تھی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ صغریٰ ایک حادثے سے گزر کر آئی تھی' اس لئے چڑچڑی ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی سخت کلامی پر افسوس بھی ہوا۔ پھر میں نے اسے مکان سے بھاگ کر نکلتے دیکھا اور......... روشنا' تم بتاتی کیوں نہیں کہ یہ سچ ہے۔"

"جہانگیر کے احساسات کی تو میں تصدیق نہیں کر سکتی۔ اس سے قطع نظر ہر بات درست ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے سوچا تھا کہ صغریٰ کو روک کر اس سے اپنے خراب رویے کی معذرت کروں گا لیکن اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا' ایک چیخ ماری اور کگر پر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ میں اسے دریا میں گرنے سے بچانے کے لئے اس کے پیچھے بھاگا۔ پھر اچانک تم نے مجھے گھسیٹ لیا اور رگڑ ڈالا۔ خیر' مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں تمہاری معذرت قبول کر لوں گا۔" اتنا کہہ کر جہانگیر' صغریٰ سے مخاطب ہو گیا۔ "تم مجھ پر احمقانہ الزامات مت لگاؤ۔ اگر میں نے نادانستگی میں تمہیں ڈرا دیا تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اب اٹھو اور روشنا کے ساتھ گھر واپس جاؤ۔"

لیکن جہانگیر جیسے ہی اس کی طرف بڑھا' وہ سہمی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ "تم.........

تم میرے قریب نہ آنا۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

جہانگیر ٹھٹک گیا۔ آدم اس کے اور صغریٰ کے درمیان آگیا تھا۔ میں اس کے چہرے کا تاثر تو نہیں دیکھ سکی لیکن وہ یقیناً پریشان تھا۔ "خدا کی پناہ! میں کیسے سمجھاؤں۔" اس نے کہا اور موٹر روم کی طرف چل دیا۔

میں نے اور آدم نے صغریٰ کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ "چلو گڑیا.......... میرے ساتھ گھر چلو۔" میں نے اسے چمکارا۔ "تم کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں راشد سے مل کر اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔"

"لیکن صغریٰ، اس کا کیمپ تو بہت دور ہے۔ خیر، اس سے کل مل لینا۔ آؤ چلیں، آدم اور میں تمہارے ساتھ ہیں۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

صغریٰ کچھ دور چلی۔ پھر اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ بے سدھ ہو گئی۔ آدم خان نے بغیر کچھ کہے اسے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح بازوؤں پر اٹھالیا۔ میں اس کے پیچھے چلتی رہی۔ وہ گھر کے عقبی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ صغریٰ کسمسانے لگی۔ "شکریہ آدم بھائی! میں چل سکتی ہوں۔ پتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

آدم نے اسے اتار دیا۔ وہ ہمیں شب بخیر کہہ کے گھر میں جانے لگی۔ آدم نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ "اب تم پوری طرح ہوش و حواس میں ہو۔ بتاؤ تو۔ ہوا کیا تھا؟"

میں پریشان ہو گئی۔ ثبوت کسی بات کا نہیں تھا لیکن دادا جی کے کان میں بھنک بھی پڑ جاتی تو کھیل بگڑ جاتا۔ "جہانگیر تمہیں بتا چکا ہے کہ کیا ہوا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "صغریٰ خواہ مخواہ ڈر گئی تھی۔"

"تم تو یہی کہو گی۔"

آدم کے لہجے نے صغریٰ کو چونکا دیا۔ میں نے آدم سے کہا۔ "تم بات کا بتنگڑ بنانے کی کوشش مت کرو۔ یہ ارادہ قتل کا کیس ہرگز نہیں ہے۔"

"باجی..........! صغریٰ نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے معلوم ہے جان، تم نے یہی کہا تھا مگر تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھیں۔" میں نے صغریٰ کی بات کاٹ دی۔

"جہانگیر تاریکی میں کسی دیو کی طرح نظر آیا ہو گا۔ تم ڈر گئی ہو گی۔"

"تم صغریٰ کو بولنے دو۔" آدم نے جھنجلا کر کہا۔

میں نے آدم کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ پھر صغریٰ سے کہا۔ "تم خود ہی بتا دو گڑیا۔"

صغریٰ کی آنکھوں سے الجھن جھانک رہی تھی۔ تاہم اس نے کہا۔ "باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں خواہ مخواہ ڈر گئی تھی۔ میں حادثے کی وجہ سے ویسے ہی اعصاب زدہ ہو رہی تھی اور لڑائی کی وجہ سے میں جہانگیر سے چڑی ہوئی تھی۔ میں نے خواہ مخواہ کا افسانہ بنا ڈالا۔"

"ٹھیک ہے، تب میں چلتا ہوں۔ شب بخیر۔" آدم نے خشک لہجے میں کہا اور پلٹ کر چل دیا۔

☆======☆======☆

موٹر روم صاف ستھرا تھا۔ میں نے سوئچ آف کیا۔ موٹر رک گئی۔ پھر میں نے روشنیوں کے تمام سوئچ بھی آف کر دیے۔ اسی وقت آدم دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ میں اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ میں خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں زبان نہ کھول سکی۔

"اپنے حلیف کی پردہ پوشی کر رہی ہو؟" آدم نے کہا۔ "اس بات کی وضاحت کر سکو گی کہ جہانگیر موٹر چلتی ہوئی کیوں چھوڑ گیا تھا۔"

"دیکھو، تم کچھ بھی سمجھو گے مگر ہم نے تمہیں حقیقت بتائی تھی۔" میں نے معقولیت کا مظاہرہ کیا۔ "بلاوجہ رائی کا پربت کیوں بناتے ہو۔"

"آج رات کے واقعہ کے بعد یہ نہ سمجھو کہ میں اس معاملے کو یونہی چھوڑ دوں گا۔"

"کیسا واقعہ؟ ہوا کیا ہے آخر؟" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ صرف اس لیے کہ میں یہاں موجود تھا اور شاید ہونی تمہاری موجودگی کی وجہ سے بھی رک گئی۔"

"تمہارے خیال میں مَیں.........." میں کہتے کہتے رک گئی۔ "صغریٰ نے خود تمہیں حقیقت بتا دی تھی۔"

"اس نے وہی کچھ کہا تھا، جو تم اس سے کہلوانا چاہتی تھیں۔ ورنہ اس نے تو شروع

ہی میں بتا دیا تھا کہ جہانگیر نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"اس وقت وہ خوفزدہ تھی۔"

"وہ تم پر اعتماد کرتی ہے۔ میری طرح وہ بھی بے وقوف ہے لیکن اس کی حماقت بلاجواز نہیں ہے۔ وہ کم عمر ہے اور تمہاری حقیقت سے واقف بھی نہیں ہے۔ میں نہ جانے کیوں بے وقوف بن رہا ہوں۔"

"سنو آدم..........! میں بھی خوفزدہ تھی۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ جہانگیر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تمہارے فراڈ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا' بالخصوص صغریٰ کو۔ میں نے نہ جانے کیوں تمہاری بات مان لی اور تمہیں اپنا بہروپ چلانے دیا مگر آج رات کے واقعہ کے بعد میں خاموش نہیں رہ سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روک سکتی۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟ پولیس کو فون کرو گے؟"

وہ ایک لمحے کو گڑبڑایا' پھر ہموار لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ کرنے سے پہلے تمہیں وارننگ دوں گا۔ سو میں تمہیں 24 گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ جہانگیر سے ناتا توڑو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم یہ کیسے کرو گی اور یہ بھی سن لو' زریاب خان کی موت کے بعد بھی کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ کرنا ورنہ جیل جاؤ گی۔ جہانگیر اور کلثوم بھی بھگتیں گے۔ مجھے ان کی کوئی پروا بھی نہیں ہے۔"

میں مخمصے میں پڑ گی۔ فیصلہ بے حد مشکل تھا۔ "آدم........!" بالآخر میں نے کہا۔

"میں ابھی تمہیں یہ بات بتانا نہیں چاہتی تھی' اس لیے کہ میرا خیال تھا' میں ابھی تمہارا سامنا نہیں کر سکوں گی۔ مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ........" میری آواز بکھرنے لگی۔ "........ کہ تم مجھے جھوٹا سمجھو۔ اس رات صندل کے درخت کے پاس میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔"

"اچھا........ واقعی!" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں۔ تمہیں یہ یقین دلانا آسان تھا کہ میں فراڈ ہوں۔ میرے لیے روشنا کی حیثیت سے تمہارا سامنا کرنا کٹھن تھا۔ سنو آدم........! میں........ روشنا ہوں۔ روشنا فتح یاب۔"

"بہت خوب!"

"تمہیں یقین نہیں آیا نا؟"

"دیکھو لڑکی........! آج میں پریوں کی کہانیاں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

"لیکن میں سچ مچ روشنا ہوں۔ یقین کرو۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم یہاں جمی رہیں تو بہت جلد تمہیں خود کو روشنا ثابت کرنے کے بے شمار مواقع ملیں گے۔"

اب خود پر قابو رکھنا میرے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ "اگر تم نے مجھے اس پر مجبور کیا تو تمہیں لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میرے روشنا ہونے کا ثبوت تمہاری رسوائی کا سبب ہو گا۔"

"بہت خوب! اتنا کچھ ہونے کے باوجود مجھے بلیک میل بھی کرو گی۔" اس نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' تو تمہیں میری بات پر یقین نہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "چلو' اب جھوٹا ثابت کرو مجھے۔ پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

وہ ایک لمحے کھڑا مجھے بغور دیکھتا رہا۔ پھر بغیر ایک لفظ کہے پلٹ کر چل دیا۔ میں نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔ میرا سر پھوڑے کی طرح دھک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا' جاؤں اور بستر پر ڈھیر ہو جاؤں۔

"خدا کی قسم........ تم نے حیران کر دیا مجھے۔" عقب سے جہانگیر نے کہا۔

میں نے پلٹ کر خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تم کہاں تھے؟" میں نے کہا۔ پھر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "کتنا کچھ سنا ہے تم نے؟"

اس نے قہقہہ لگایا اور روشنی کر دی۔ "میں اس جگہ تھا' جہاں آدم اور تم مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میرا خیال تھا' تم آدم سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتی ہو اور میرا خیال درست تھا۔ تم نے کمال کر دیا۔" پھر اس نے پوچھا۔ "یہ موٹر تم نے بند کی ہے؟"

"ہاں۔ قتل کے وقت کہیں اور موجودگی کی وہ شہادت مؤثر ثابت ہو سکتی تھی۔"

اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ "تو اب تم بھی قتل کی باتیں کرو گی؟"

"ہاں۔ تم نے موٹر چلائی۔ موٹر روم کو روشن رکھا۔ تاکہ گھر سے روشنیاں دیکھی جا سکیں۔ موٹر کی آواز بھی سنائی دے اور سب یہ سمجھیں کہ تم موٹر روم میں موجود ہو۔"

جبکہ درحقیقت صغریٰ کو قتل کر رہے ہو۔"

اس کی آنکھوں میں سفاکی در آئی۔ "چلو مان لیتے ہیں کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پھر؟" اس کا لہجہ خطرناک حد تک نرم تھا۔

"آدم ٹھیک کہہ رہا تھا جہانگیر۔ تم واقعی صغریٰ کو قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا' پھر بہ دستور نرم لہجے میں بولا۔ "تو پھر؟"

میں نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر یہ کہ اگر تم نے سوچا تھا کہ میں یہ سفاکی برداشت کرلوں گی تم نرے احمق ہو۔ تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟ اگر صغریٰ کو کچھ ہو جاتا تو میں تمہیں تباہ کر کے رکھ دیتی۔ ویسے یہ ثابت ہو گیا کہ تم مجرمانہ ذہنیت کے مالک ہو۔"

وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ "میں جانتا تھا کہ تم قتل کی حد تک میرا ساتھ نہیں دو گی۔ میں بے وقوف نہیں ہوں جاناں۔ تمہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ پانی میں سے صغریٰ کی پھولی ہوئی لاش برآمد ہوتی تو تم یہ کیسے ثابت کرتیں کہ اسے میں نے قتل کیا ہے۔ تمہیں خاموش رہنا پڑتا۔"

"خدا کی پناہ! میں آج رات تم سے ہمدردی محسوس کر رہی تھی.......... تم سے۔" میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"چلو' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بتاؤ' تم نے آدم کو خاموش رہنے پر رضامند کر لیا یا نہیں؟"

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں عجیب سی تھیں۔ میرے رگ وپے میں خوف سرایت کرنے لگا۔ "یہ تم اسے آدم کب سے کہنے لگیں؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ مگر میں نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ "یہاں تم سے چُوک ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "لگتا ہے' روشنا اور آدم کے درمیان بے تکلفی تھی۔ آج میں حویلی باغ میں سیب لینے گئی تو آدم خان نے مجھے روشنا کہہ کر پکارا تھا۔ روشنا یقیناً اسے آدم کہتی ہو گی۔ پھر صغریٰ نے بھی یہی بتایا تھا۔ اب میں جا رہی ہوں اور یاد رکھنا' آئندہ ایسے معاملے میں مجھ سے کسی تعاون کی امید نہ رکھنا۔"

دروازے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نظروں میں استعجاب بھی تھا اور محبت

بھی۔

"شب بخیر روشنا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆======☆======☆

اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے اور بستر پر لیٹی ان پیچیدگیوں کے بارے میں سوچتی رہی جو مجھے درپیش تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاند ڈوب گیا اور تاریکی گہری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد کسی پرندے نے طلوعِ آفتاب کا گیت چھیڑا' تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ میں اٹھی اور کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ ہر چیز اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔ ہوا میں تازگی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر ایسا لگا جیسے میں نے مہکتی ہوئی روشنی اپنے وجود میں اتار لی ہے۔ میری نظریں چراگاہ کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں آدم کی گھوڑی ریشم' چرنے میں مصروف تھی۔

میرا خیال ہے' کبھی کبھی انسان کے بلاارادہ افعال کا محرک ماضی نہیں مستقبل ہوتا ہے۔ میں بلاارادہ کھڑکی کے پاس سے ہٹی۔ باتھ روم میں جا کر کلی کی اور منہ پر دو چار چھپکے مارے۔ پھر میں دبے قدموں باہر نکل آئی۔ میرے قدم خود بہ خود چراگاہ کی طرف اٹھ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لگام تھی۔

ریشم نے کان پھڑپھڑائے اور سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں جنگلے کی طرف بڑھی اور اس سے ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ریشم چند لمحے مجھے دیکھتی رہی' پھر میری طرف بڑھنے لگی۔ اس کی چال میں بلا کا مستانہ پن تھا۔ نتھنے پھڑک رہے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں میں تجسس تھا۔ وہ مجھ سے کوئی ایک گز دور رک گئی۔ "آؤ ریشم! میرے پاس آؤ۔" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پیار بھری سرگوشی میں اسے پکارا۔ اس نے ایک لمحے کو گردن آگے بڑھائی۔ پھر خود بھی آگے بڑھی۔ میں اب بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس کی سانسیں میرے پیروں سے' کمر سے اور پھر میری گردن سے ٹکرائیں۔ اس نے بتدریج سر اٹھایا تھا اور اس کے انداز میں بلا کا حسن تھا اور وقار تھا۔ اس نے میری آستین اپنے منہ میں دبائی اور جھٹکے سے کھینچنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن سہلائی۔ اس کا پورا جسم مرتعش ہو گیا۔ میرا ہاتھ اس کے کانوں کی طرف بڑھا۔ اس نے خود سپردگی کے انداز میں سر جھکا لیا۔ میں اس کے ایال کو سہلاتی رہی۔ پھر میں جنگلے کے پاس سے ہٹی۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنا منہ میرے جسم سے رگڑتی رہی۔ اس کے انداز میں اتنی شدت تھی کہ میں پھر

ریلنگ سے ٹیک لگانے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے اسے چمکارا۔
"ریشم........ میری جان........ ریشم۔" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے موڑا۔
"آؤ۔ چلیں۔" میں نے لگام اس کے منہ کی طرف بڑھائی۔ اس نے منہ کھول دیا اور لگام دانتوں میں دبا لی۔ میں نے لگام کس دی۔ اس دوران میں مسلسل اس کی گردن کو تھپتھپاتی رہی تھی۔ پھر لگام دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے میں جنگلے پر چڑھی اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ اس نے کوئی تعرض نہ کیا' جیسے اس کی عادی رہی ہو۔ پھر وہ میرے اشارے پر آگے بڑھی۔ اس کی چال اتنی ہموار تھی کہ وہ تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ مجھے پیٹھ پر اٹھائے وسیع چراگاہ میں ہوا کے دوش پر تیرتی پھری۔ وہ میرے اشارے بھی بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے آج تک سدھایا نہیں گیا ہے اور اس پر کسی نے سواری نہیں کی ہے۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ ایک والہانہ خوشی میرے رگ و پے میں رقصاں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا' میں پاگل ہو جاؤں گی۔

پھر میں نے اسے دوڑایا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی لیکن قدم بے حد ہمواری سے اٹھتے تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے وقت گزرنے کا احساس ہوا تو میں نے باگیں کھینچیں۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ وہ سرکشی پر آمادہ ہے اور میرا حکم قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ وہ رک گئی۔ "چلو ریشم' دیر ہو گئی اب واپس چلیں۔" میں نے اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشی کی۔

میں اتر رہی تھی کہ مجھے آدم نظر آیا۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں زین اور لگام تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی میرا خیال تھا' وہ برہم ہو گا' مجھے ملامت کرے گا مگر اس نے صرف اتنا کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' کم از کم آدم سے۔ کیونکہ ہم دونوں کچھ کہے بغیر ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔ میں نے کہا۔ "میں اور کیا کرتی۔ اگر مجھے یہاں تمہاری موجودگی کا علم ہوتا تو میں ہرگز یہاں نہ آتی۔ جب مجھے پتا چلا کہ مجھے تمہارا سامنا کرنا پڑے گا تو میں ڈر گئی۔ ایسے میں تم نے امکان ظاہر کیا کہ میں روشنا نہیں ہوں تو جیسے مجھے راہِ فرار مل گئی۔ یہ زیادہ آسان تھا۔ بشرطیکہ میں تمہیں اپنے فراڈ ہونے کا راز فاش کرنے سے روکے رکھتی۔"

آدم مجھے یوں دیکھ رہا تھا' جیسے میں کسی اجنبی زبان میں لکھی ہوئی عبارت ہوں'

ریشم سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں واپس آنا چاہتی تھی۔ مجھے دادا جی کی محبت کا قرض چکانا تھا۔" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنی اذیت پر حیرت تھی۔ میرے وجود کا وہ حصہ مر چکا تھا جو آدم سے محبت کرتا تھا۔ پھر بھی اذیت میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ "جہانگیر کے خوف نے ہمیشہ میرا راستہ روکا تھا مگر اس بار میں نے یہ خطرہ بھی مول لے ہی لیا ہے۔ مجھے دادا جی سے ملنا تھا۔"

"کیا مطلب؟ تم جہانگیر سے کیوں خوف زدہ تھیں؟" آدم نے پوچھا۔

"اس نے ایک رات دریا کے کنارے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے رات کو صغریٰ کو........."

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟" آدم ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"جہانگیر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس وقت اسے فارم ملنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے فارم کے حصول کی واحد صورت یہی تھی کہ مجھ سے شادی کر لے۔ چنانچہ وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ آخری رات اس سلسلے میں میری اس سے تلخ کلامی ہوئی۔ میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا کہ آئندہ وہ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ اس پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے........" میں نے توقف کیا۔ پھر بولی۔ "اسی لیے تو رات صغریٰ کے معاملے میں مجھے خطرے کا احساس ہو گیا اور میں گھر سے نکل آئی کہ صغریٰ کو بچا سکوں۔"

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ جیسے یہ اس کا حق ہو۔ یہ اس کا آٹھ سال پرانا لہجہ تھا۔

"کیا فرق پڑتا اس سے۔ اس رات بھی وہی کچھ ہوا تھا جو کل رات ہوا۔ میں تم سے مل کر آ رہی تھی کہ راستے میں جہانگیر مل گیا۔ میں بڑی مشکل سے بچ کر بھاگی۔ گھر پہنچی تو میری کیفیت ہسٹریائی تھی۔ میں نے دادا جی کو جہانگیر کی حرکت کے بارے میں بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ الٹا مجھ پر ناراض ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کہاں تھی۔ انہوں نے خود ہی جہانگیر کو مجھے تلاش کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اب تم سمجھ رہے ہو نا۔ مجھے جانا ہی تھا۔ تمہاری اور اپنی وجہ سے۔ اور اس لیے بھی کہ میں جہانگیر سے خوف زدہ تھی۔ دادا جی اس کی طرفداری کر رہے تھے اور مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ انہیں کسی نہ کسی طرح تمہاری اور میری محبت کا علم ہو جائے گا اور اس طرح زاریہ باجی کو بھی........ پھر

"وہ......... وہ........"

"اوہ........ خدایا! خیر' پھر تم واپس آئیں تو جہانگیر سے کیسے مل بیٹھیں؟"

"میں نے بلاوجہ خطرہ مول لیا تھا۔ میں فارم کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی' میں سوچنا چاہتی تھی کہ دادا جی تک کیسے پہنچوں۔ جہانگیر نے مجھے دیکھ لیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا دریا تک چلا آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے پھر خوف زدہ کردیا۔ بس' میں نے اس کے انداز میں بے یقینی محسوس کرلی تھی' اسی لئے میں نے خود کو روشنا کے بجائے ثمینہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' تمہیں معلوم ہے۔"

اب آٹھ سال بعد ہم پہلی بار صحیح معنوں میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر آدم نے خاموشی توڑی۔ "چلو خیر' تمہارے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آگئی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برہمی اور نفرت سے بھرپور سہی' تم مجھے کوئی خط تو لکھتیں۔ خط کیوں نہیں لکھا تم نے؟"

"میں نے تمہیں خط لکھا تھا۔"

اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی مجھے پتا چل گیا کہ خط اسے نہیں ملا۔ "خط؟ کیسا خط؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں نے شہر پہنچتے ہی تمہیں خط لکھا تھا۔"

"مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ کیا لکھا تھا تم نے اس خط میں؟"

آٹھ برس میں نے اس کرب میں گزارے تھے کہ اس نے خط ملنے کے باوجود مجھے نظرانداز کیا۔ سوچا تھا کہ کبھی ملاقات ہوئی تو اسے.......... میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے لکھا تھا کہ تمہاری خوشی کے لئے میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔ تم جہاں کہو گے' تمہارے ساتھ چلوں گی' تمہارے ساتھ رہوں گی ہمیشہ۔"

اس کے چہرے پر اذیت اُبھر آئی' جیسے میں نے اُسے تھپڑ مار دیا ہو۔ وہ بہت تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ "افسوس........ تمہارا خط مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔"

"اب مجھے ایسی نظروں سے نہ دیکھو۔ اب سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔" میں نے اُسے ٹوکا۔ "میں نے مدتوں تمہارے خط کا انتظار کیا۔ پھر فون کیے۔ زاریہ باجی نے تمہیں نہیں بتایا۔ بہرحال' میری ہر کوشش ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد میں تمہیں دوبارہ خط نہیں لکھ سکتی تھی۔ غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں میں؟"

"نہیں' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

"اتنے افسردہ نہ ہو۔ خط تم تک نہیں پہنچ سکا تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ پھر چونک کر کہا۔ "آدم.........!"

اس نے نظریں اٹھائیں۔ "کیا بات ہے روشنا؟"

"اب مجھے یہ فکر ہو رہی ہے کہ میرا خط کہاں گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زاریہ باجی تک پہنچ گیا ہو۔"

"زاریہ تک........ نہیں......... ہرگز نہیں۔ کہیں ضائع ہوگیا ہو گا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں' زاریہ کو اس خط کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔"

"آدم......... مجھے بتاؤ' زاریہ باجی کا انتقال کیسے ہوا؟"

"اس کا تم سے یا تمہارے خط سے کوئی تعلق نہیں۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"درمیان میں کئی سال حائل ہیں اور خط اسے ملا ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی دوسری چیزوں کے ساتھ ملتا۔ وہ اس خط کو ہرگز ضائع نہ کرتی۔"

"مجھے بتاؤ نا۔ باجی نے خودکشی کی تھی؟"

وہ یوں سمٹ گیا' جیسے اچانک ہی اس پر کوئی بوجھ آپڑا ہو۔ "ہاں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

ایک بار پھر خاموشی چھاگئی۔ میں سوچتی رہی' زندگی کا یہ باب ختم ہو رہا تھا۔ تمام وضاحتیں میسر آگئی تھیں۔ اب کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ آدم کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اس انداز میں سوچ رہا ہے مگر پھر اس کی آنکھوں میں ضد سی چمک اٹھی۔ وہ ایک دم آگے بڑھ آیا۔

"اب میں چلتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ جہانگیر مجھے ریشم کے قریب دیکھے۔"

"روشنا........"

"پلیز آدم! مجھے یہ تکلیف دہ بات دہرانے پر مجبور نہ کرو کہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔"

"تم بھی مجھے یہ دہرانے پر مجبور نہ کرو کہ کچھ بھی ختم نہیں ہوا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم کیا سمجھتی ہو۔ میں نے تم پر اعتبار کیوں کیا۔ حالانکہ اس کی گنجائش نہیں تھی۔ صرف اس لئے کہ میرے اندر' بہت گہرائی میں یہ یقین موجود تھا کہ تم روشنا ہو اور میری مردہ محبت......... یہ تو بتاؤ کہ اس روز میرے ہاتھوں کو دیکھ کر تمہیں رونا کیوں آگیا تھا؟"

"آدم.......... ایسی باتیں مت کرو۔"

"تمہیں آج بھی میرا خیال ہے۔ تم آج بھی میری محبت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ کم از کم اب یہ ممکن نہیں۔"

"زاریہ کی وجہ سے؟"

"تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ چیز ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہے گی۔ پہلے بھی حائل تھی مگر ہمیں علم نہیں تھا۔"

"یقین کرو روشنا' میں تلافی کر چکا ہوں۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری تلافی کی اذیتوں میں سب سے ہلکی اذیت ان ہاتھوں نے اٹھائی ہے۔ سمجھیں' اب بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"داداجی کی حالت اچھی نہیں۔ وہ زیادہ عرصہ نہیں جئیں گے۔" میں نے سوگوار لہجے میں کہا۔ "ان کے بعد میں چلی جاؤں گی۔ فارم جہانگیر کو مل جائے گا۔ ہم کبھی نہیں مل سکیں گے' زندگی اسی طرح جاری و ساری رہے گی۔ زندگی عجیب طاقت ور چیز ہے۔ جیسی بھی ملے' چاہو نہ چاہو' گزارنا پڑتی ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن موت آسان بھی ہے اور مہربان بھی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے جنگلا پھلانگا اور دریا کی طرف جانے والے راستے پر چل دیا۔

☆=====☆=====☆

ساڑھے آٹھ بجے راشد کا فون آیا وہ صغریٰ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ وہ ٹھیک ہے۔ حادثے کے علاوہ میں نے اسے سب کچھ نہیں بتایا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ صغریٰ آج کسی وقت اس سے ملنے آئے گی۔

"میں خود آرہا ہوں۔ ابھی.......... آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔"

"بات سنو راشد! ابھی تو وہ سو کر بھی نہیں اٹھی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے جلدی سے اوپر جا کر صغریٰ کو مطلع کر دیا۔ وہ کھل اٹھی اور فوری طور پر مناسب کپڑوں کی جستجو میں الماری اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس کا ہیجان اور مسرت دیدنی

تھی۔

آدھے گھنٹے بعد راشد آگیا۔ وہ صرف چائے پینے کے لیے رکا۔ صغریٰ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں نے ان سے ان کا پروگرام بھی نہیں پوچھا۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے باغیچے میں آگئی جسے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ وہ زبانِ حال سے نگہداشت میسر نہ آنے کی شکایت کر رہا تھا۔ میں نے کیاریوں کی صفائی شروع کی اور یک لخت ہی جیسے ماضی میں پہنچ گئی۔ پرانی یادیں بے حد تکلیف دہ تھیں۔ آٹھ سال پہلے میں نے تصور میں آدم کو بسا کر ان کیاریوں میں پودے لگائے تھے۔ پودوں کی آبیاری کی تھی۔ ایسے میں میری آنکھوں میں آدم کے خواب ہوتے تھے۔ آنسو میرے ہاتھوں پر گرے تو مجھے احساس ہوا کہ میں رو رہی ہوں۔ شاید میں اپنی مُردہ محبت کی لحد پر شبنم افشانی کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد زینب نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دروازے میں کھڑی مجھے اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے بے تحاشا پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"روشنابی بی......! روشنابی بی......! جلدی آؤ۔ فوراً۔" اس نے مجھے پکارا۔

میں بوکھلا کر اس کی طرف لپکی۔ "کیا بات ہے؟ داداجی تو خیریت سے ہیں؟"

"نہیں۔ ان کی طبیعت.........."

میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "کیا ہوا داداجی کو؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے وہ بالکل ٹھیک تھے۔ میں انہیں ناشتہ دے کر آئی۔ اچانک ہی طبیعت خراب ہو گئی اُن کی۔"

میں مکان میں داخل ہو گئی۔ زینب مسلسل باتیں کرتی میرے ساتھ چل رہی تھی گھر میں تو جیسے سناٹے سے اتر آئے تھے۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ زینب' داداجی سے کھانے کے متعلق پوچھنے گئی تو اس نے انھیں آرام کرسی میں بکھرے پایا۔ زینب نے کلثوم کو بلایا۔ دونوں نے جیسے تیسے انھیں آرام کرسی سے بستر پر منتقل کیا۔ پھر زینب مجھے بلانے کے لیے آئی۔

میں زینے کے قریب پہنچی تھی کہ کلثوم اترتی دکھائی دی۔ زینب کے برعکس وہ بے حد پُرسکون اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں دبے دبے ہیجان کی جھلک نظر آئی۔

"روشنا......! خان بابا کی حالت اچھی نہیں۔ تم فوراً ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرو۔ فون نمبر ڈائری میں موجود ہے۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ پھر زینب سے بولی۔ "کیتلی میں پانی

گرم ہو گیا ہو گا۔ دو بوتلیں بھر لاؤ۔ میں خان بابا کے پاس ہوں اور ہاں روشنا سنو' ڈاکٹر کو فون کرنے کے بعد تم جا کر جہانگیر کو بلا لاؤ۔"

"کلثوم......! تم ڈاکٹر کو فون کرو۔ داداجی کے پاس میں جا رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم ان کا مجھ سے بہتر خیال نہیں رکھ سکتیں۔ جاؤ' جلدی سے فون کرو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی' جیسے مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔

میں فون کی طرف لپکی۔ ڈائری' انسٹرومنٹ کے پاس ہی رکھی تھی۔ میں نے جلدی جلدی نمبر ملایا۔ ڈاکٹر موجود تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد اسے جلد از جلد پہنچنے کی ہدایت کی۔ پھر میں زینے کی طرف پلٹی۔ اسی وقت سیڑھیوں پر کلثوم نمودار ہوئی۔

اس نے پوچھا۔ "فون کر دیا تم نے؟ ڈاکٹر سے بات ہوئی؟"

"ہاں۔ وہ فوراً آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا کر......"

"میں پہلے داداجی سے ملوں گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"بے کار ہے' وہ ہوش میں نہیں ہیں۔ جاؤ' جہانگیر کو بلا لاؤ۔ وہ کھیتوں میں ہو گا۔ اسے علم ہونا بہت ضروری ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے اسے نظرانداز کر دیا اور داداجی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کھڑکیوں کے پردے قدرے سرکے ہوئے تھے۔ کمرے میں دھوپ روشنی کر رہی تھی۔ داداجی بستر پر تھے۔ سانسوں کی آمدورفت کے سوا ان کا جسم ساکت تھا۔ میں نے پلٹ کر کلثوم کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثر نے میرے رہے سہے شکوک بھی زائل کر دیے۔ داداجی کی طبیعت اچانک خراب ہونے میں یقینی طور پر بیرونی عوامل کا ہاتھ تھا۔ کلثوم کی آنکھوں میں دبی دبی خوشی چمک رہی تھی۔ اس نے مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"افسوس ناک واقعہ ہے' ہے نا؟" اس نے کہا۔

"ہاں لیکن اس قدر اچانک۔ کچھ دیر پہلے تو یہ ٹھیک ٹھاک تھے۔"

"ششش...... زینب بھی موجود ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "شکر کرو' یہ سب کچھ وکیل کی آمد سے پہلے نہیں ہوا۔ ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔"

"تم شکر کرو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اب میں جہانگیر کو بلانے کے لیے جا رہی

ہوں۔"

جہانگیر کھیت میں ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ٹریکٹر روک دیا۔ میں نے ٹریکٹر کے شور کے درمیان چیختے ہوئے کہا۔ "گھر چلو۔ داداجی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

جہانگیر نے ٹریکٹر کا انجن بند کر دیا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"داداجی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ فوراً گھر چلو۔"

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا اور فوراً ہی معدوم بھی ہو گیا۔ ایسا لگا' جیسے باطنی طور پر اس نے سکون کی سانس لی ہو۔ ایک لمحے کے لیے وہ ایسا درندہ لگا' جو شکار کے بعد کی طمانیت سے آسودہ ہو۔ اس لمحے میں نے اس سے اتنی شدید نفرت کی کہ پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس روز بھی نہیں' جب اس نے مجھے شادی پر مجبور کرنے اور اس میں ناکامی کے بعد قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت بھی نہیں' جب اس نے مجھ پر...... روشنا پر الزام لگایا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی' اس لیے بھاگ گئی۔

ڈاکٹر آیا۔ شام تک رکا رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔ داداجی کو ایک لمحے کے لئے بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ ان کی سانسیں رُک رُک کر آ رہی تھیں اور پُرشور تھیں۔ میں نے ان کے بستر کے پاس کرسی لگا لی تھی اور ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھے جا رہی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کے پاس سے نہیں ہٹی۔ دوسری کرسی پر جہانگیر کسی سنگی بت کے طرح ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں شکاری بلی کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ پہلے وہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا تھا۔ میں برداشت کرتی رہی مگر جب ناقابلِ برداشت ہو گیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ سیدھا بیٹھے ورنہ اٹھ کر چلا جائے۔ اس نے حیرت سے ایک نظر مجھے دیکھا تھا اور پھر خاموشی سے کمرے سے چلا گیا تھا۔ نہ جانے اس وقت میرے چہرے پر کیا لکھا نظر آیا ہو گا۔ مجھے کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ میں اس وقت اس سے کچھ چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ آیا تو کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔

صغریٰ واپس نہیں آئی تھی۔ جہانگیر نے اپنے ایک مزارع کو اُسے بلانے کی غرض سے کیمپ بھیج دیا تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ صغریٰ اور راشد کیمپ میں موجود نہیں ہیں۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ دونوں حویلی گئے ہوں گے۔ راشد نے آدم سے بات کر لی تھی اور حویلی کے تہہ خانوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے یہ بات جہانگیر کو بتا دی کہ وہ کسی کو بھیج کر صغریٰ کو وہاں سے بلوا لے لیکن پتا چلا کہ حویلی بھی سنسان پڑی ہے۔

ڈاکٹر سات بجے کے قریب دوبارہ آیا' کچھ دیر رُکا اور پھر گیا تھا۔ میں بیٹھی داداجی کے چہرے کو تکتی رہی۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ کچھ نہ سوچوں' مگر سوچوں پر کب کسی کا زور چلتا ہے۔ جہانگیر بیٹھا مجھے تکے جا رہا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب دُھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔ روشنیاں دُھندلانے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے طوفان کا روپ دھار لیا۔ بجلی کڑک رہی تھی' بادل گرج رہے تھے۔ لگتا تھا' کچھ ہونے والا ہے۔ صغریٰ نہیں آئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ طوفان میں گھر گئی ہے' بمشکل کہیں پناہ تلاش کی ہو گی انھوں نے۔ اب وہ نہیں آسکے گی۔ کم از کم آج رات نہیں۔

میں اٹھی۔ میں نے کھڑکیاں بند کیں اور پردے کھینچ دیے۔

واپس آئی تو داداجی کو کسمساتے دیکھا۔ ان کی آنکھیں کھلیں۔ ایسا لگا' جیسے وہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر وہ سر کو حرکت دیے بغیر صاف آواز میں بولے۔ "روشنا!"

میں ان پر جھک گئی۔ میں نے کمبل میں اپنا ہاتھ ڈالا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "جی داداجی......! میں یہاں ہوں۔"

"اور جہانگیر؟"

"وہ بیٹھا ہے۔" میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے آنکھیں گھمائیں اور پکارا۔ "جہانگیر!"

"جی خان بابا۔"

"میں بیمار ہوں نا!"

"جی خان بابا۔"

"میں مر رہا ہوں نا؟"

"جی خان بابا۔"

میں احتجاج کرنا چاہتی تھی مگر داداجی کی مسکراہٹ نے میرا راستہ روک لیا۔

"جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات جہانگیر نہ بتاتا' تب بھی مجھے معلوم تھی۔ صغریٰ کہاں ہے؟"

"آتی ہی ہو گی داداجی۔ وہ شاید طوفان میں پھنس گئی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں تھا کہ آپ......" مجھ سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔ "وہ راشد کے ساتھ گئی ہے۔"

مجھے ایسا لگا' جیسے داداجی کی نگاہ مستفسرانہ ہے۔

"داداجی...... آپ کو راشد یاد نہیں؟ کل رات وہ دعوت میں بھی آیا تھا۔" میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

ایسا لگا' جیسے وہ اپنے ذہن کو مرتکز کر کے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ ناکام کوشش تھی۔ میں ان پر جھک گئی۔ "داداجی..........! راشد آپ کو اچھا لگا تھا۔ وہ صغریٰ سے شادی کرے گا۔ پھر وہ دونوں شہر میں رہیں گے۔ صغریٰ بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔" "آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اسی وقت بجلی کا کڑاکا ہوا۔ کمرا ایک لخت روشن ہو گیا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی بھاری چیز ڈھے گئی ہو۔ "یہ...... یہ کیا تھا؟" داداجی نے نحیف آواز میں پوچھا۔

جہانگیر کھڑکی کے پاس گیا۔ اس نے پردہ سرکا کے باہر جھانکا اور پھر بستر کے پاس چلا آیا۔ "میرا خیال ہے' حویلی کے قریب کوئی پرانا درخت گرا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں خان بابا۔ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تم اچھے لڑکے ہو جہانگیر۔" داداجی کی آواز بے حد واضح تھی۔ "کاش......! کاش روشنا واپس آ گئی ہوتی۔ تم دونوں کی جوڑی بہت اچھی رہتی۔"

"دادا جی.........!" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گئی۔ میں نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے اپنا چہرہ داداجی کے سینے میں چھپا لیا۔ جہانگیر کی نگاہیں مجھے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں اب دو ہی افراد رہ گئے ہیں...... میں اور جہانگیر!

نیچے دروازہ کھلا' پھر بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور صغریٰ اندر آئی۔ اس کے بھیگے ہوئے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس بھی شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے اور پھر جہانگیر کو دیکھا۔ پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے کچھ دیر وہ بول بھی نہ سکی۔ بالآخر اس نے کہا۔

"باجی........... باجی........... جہانگیر.........."

میں جلدی سے اس کے اور دادا جی کے بستر کے درمیان آ گئی۔ "کیا بات ہے گڑیا...... کیا ہوا؟"

لیکن شاید وہ میری کوشش کو بھانپ گئی۔ پہلی بار اس کی نظریں داداجی کی مسہری کی طرف اٹھیں۔ اس کے چہرے پر صدمے کا تاثر ابھرا' اس کا بدن لرزا اور اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سہمے ہوئے بچوں کی طرح کہا۔ "باجی...... مجھے پتا نہیں تھا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہاں گڑیا' لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہ ابھی چند منٹ پہلے کی بات ہے۔ سب کچھ اچانک ہی ہوا۔ انھیں زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ خیر' میں تمھیں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گی۔ تم بتاؤ' کوئی خاص بات تو نہیں۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

وہ میری بانہوں میں لرزتی رہی۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ بالآخر اس نے سرگوشی میں بمشکل کہا۔ "آپ کی.......... اور جہانگیر کی مدد.........."

میں اب بھی اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں جہانگیر سے مخاطب ہوئی۔ "تم جاکر کلثوم کو بتادو اور ڈاکٹر کو بھی فون کر دو۔"

"فون خراب پڑا ہے۔" صغریٰ نے بتایا۔

"خراب پڑا ہے؟"

"ہاں۔ کلثوم نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے خراب ہوا ہے۔ آکاش بیل والے صنوبر پر بجلی گری ہے۔ درخت دو ٹکڑے ہوگیا ہے۔ حویلی کے احاطے میں جو کاٹیج ہے' وہ اسے بھی لے بیٹھا۔ کاٹیج کی چھت اور دیواریں گر چکی ہیں اور........"

"صغریٰ خود کو سنبھالو گڑیا۔" میں نے اس کی کمر تھپتھپائی۔ "بتاؤ تو' ہوا کیا ہے۔ کیا تم اس وقت کاٹیج کے قریب تھیں۔ اوہ' میرے خدا! جہانگیر....." ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ "راشد کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

صغریٰ بے تابانہ سر ہلانے لگی۔ "وہ ملبے میں دب گیا ہے۔ درخت بہت بھاری ہے اور.........."

"وہ مر تو نہیں گیا؟" جہانگیر نے بے رحمی سے پوچھا۔

صغریٰ کا جسم تن گیا۔ تاہم اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "نہیں لیکن وہ زخمی ہے۔ خود باہر نہیں آسکتا۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

خلاف توقع جہانگیر نرم لہجے میں بولا۔ "تم پریشان نہ ہو۔ ہم اسے نکالیں گے۔" یہ کہہ کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے زینوں پر اس کے اترنے کی چاپ سنائی دی۔ میں اور صغریٰ اس کے پیچھے بھاگے۔ اس نے پلٹ کر ہم سے کہا۔ "تم دونوں جاکر کار میں بیٹھو میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں نے کلثوم سے پوچھا۔ "مزارعوں میں سے کوئی موجود ہے؟"

اس نے نفی میں ہلا دیا۔ "سب چھٹی کر کے گھر جا چکے ہیں۔" پھر اس نے مجھے بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"ہاں۔ ابھی چند منٹ پہلے سب کچھ ختم ہوگیا۔ کلثوم......... تم اوپر چلی جاؤ۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور زینے کی طرف چل دی۔

ہم گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ جہانگیر آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ چیزیں تھیں۔ پھاوڑا' کلہاڑی اور صنوبر کے دو تین پتلے پتلے مگر مضبوط تنے۔ اس نے وہ چیزیں ڈکی میں رکھیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ چند لمحے بعد گاڑی گیٹ سے گزر رہی تھی۔

"اب ذرا تفصیل سے بتاؤ صغریٰ۔" جہانگیر نے کہا۔ "وہ ہے کہاں؟ کتنا زخمی ہے؟ اور کیا ہم اس تک پہنچ سکتے ہیں؟"

"کاٹیج تو پہلے ہی کھنڈر تھا۔" صغریٰ نے کہا۔ "راشد تہہ خانے میں ہے۔ وہ تہہ خانے چیک کر رہے تھے؟"

"تھے سے کیا مراد ہے تمھاری؟" میں نے چونک کر کہا۔

"آدم خان اور راشد۔"

"آدم خان بھی تھا؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری آواز اور لہجے سے آدم کے لیے اپنائیت کا اظہار ہو۔ ایسی ایک لغزش سے راز فاش ہو سکتا تھا۔

"جی ہاں۔ وہی تو راشد کو تہہ خانے دکھا رہے تھے۔ میں باہر تھی۔" صغریٰ نے بتایا۔

"کیا وہ بھی زخمی ہے؟"

"میں نے بتایا نا' وہ بھی تہہ خانے میں تھے۔" صغریٰ نے کہا۔ "جس وقت درخت گرا' وہ دونوں تہہ خانے میں تھے۔ میں نے تہہ خانے کے دروازے سے ملبہ ہٹانے کی کوشش کی لیکن آدم خان نے چیخ کر کہا کہ راشد زخمی ہوگیا ہے۔ میں خود کچھ کرنے کے بجائے مدد لے کر آؤں۔"

میں نے جہانگیر کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ شاید اس کی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ بارش کی وجہ سے راستہ بے حد خراب اور مخدوش ہوگیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ جہانگیر کے لئے راشد کی زندگی کی اہمیت ہے۔ راشد کا وجود اس بات کی ضمانت تھا کہ صغریٰ شہر میں رہے گی اور فارم سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔

اس نے ملبے کے ڈھیر کے سامنے گاڑی روک دی' وہاں کبھی صنوبر کا وہ درخت ہوتا تھا' جسے آکاش بیل نے زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

بجلی نے درخت کو دونیم کر دیا تھا۔ اکھڑے ہوئے درخت کا ایک حصہ سڑک پر گرا تھا۔ دوسرا کاٹیج کے ملبے میں دب گیا تھا۔ ہم کار سے اترے اور گیٹ کی طرف لپکے۔ جہانگیر ہچکچایا مگر صغریٰ تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ ملبے کے سامنے رک کر اس نے راشد کو پکارا۔ "راشد...... راشد......! تم خیریت سے ہو نا؟"

جواب میں آدم کی بھنچی بھنچی آواز سنائی دی۔ "راشد خیریت سے ہے۔ تم مدد لائی ہو نا؟"

"جہانگیر اور باجی آئے ہیں۔"

جہانگیر نے آگے بڑھ کر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ ہٹائی اور ٹارچ کی روشنی میں اس چھوٹے سے سوراخ کا جائزہ لیا' جو کبھی دروازہ رہا ہو گا۔ اب ملبے نے اُسے پاٹ دیا تھا۔ میں بھی آگے بڑھی۔ اس سوراخ سے تہہ خانے کی سیڑھیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیاں صاف تھیں مگر آگے ایک بھاری پتھر نے راستہ روکا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب چھت اور ایک دیوار گری تھی۔ چھت کا شہتیر سلامت تھا۔ وہ اس زاویے سے گرا تھا کہ اس کی وجہ سے اچھی خاصی بچت ہو گئی تھی۔ شہتیر نے دو دیواروں کو ڈھیر ہونے سے بچالیا تھا۔ شہتیر اور فرش کے درمیاں ایک فٹ کا فاصلہ ہو گا۔

آدم شہتیر کے نیچے پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں ہماری طرف تھیں۔ باقی جسم ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا' جیسے شہتیر اس کے اوپر گرا ہے اور وہ شہتیر کے نیچے دب گیا ہے لیکن پھر مجھے اس کے اور شہتیر کے درمیان موجود چند انچ کا خلاء نظر آ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔

"آدم خان......! تم تو زخمی نہیں ہو؟" جہانگیر نے پکارا۔

"میں خیریت سے ہوں۔" آدم نے حرکت کیے بغیر جواب دیا۔ تاہم انداز سے لگتا تھا کہ بولنے کے لئے اسے خاصی کوشش کرنا پڑی ہے۔ "البتہ راشد اندر پھنسا ہوا ہے شہتیر کے آگے کافی ملبہ پڑا ہوا ہے۔ میں کسی طرح وہ ڈھیر نہیں ہٹا سکتا۔ وہ بھی خیریت سے ہے لیکن میں اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے یہ ملبہ ہٹانا ہو گا۔ ڈاکٹر کب تک پہنچے گا؟"

"ڈاکٹر کو نہیں بلایا جاسکا۔ ہمارا فون ڈیڈ پڑا ہے" جہانگیر نے جواب دیا۔

"خدایا......! آدم خان کراہ کر رہ گیا۔

"دیکھو...... اگر راشد زیادہ زخمی نہیں ہے تو بہتر ہے کہ تم نکل آؤ۔ تمہارے نکلنے کے بعد ہمارا اس تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ ویسے بھی' کسی بھی وقت سب کچھ ڈھیر ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" جہانگیر نے کہا۔

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔" آدم نے پُر اذیت لہجے میں کہا۔ "اس کی کوئی نس کٹ گئی ہے۔"

یہ سن کر صغریٰ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

"میرا خیال ہے' خون رُک گیا ہے۔ میں اس شہتیر کو روکے ہوئے ہوں لیکن زیادہ دیر نہیں روک سکوں گا۔ روشنا...... تم جاکر کسی طرح ڈاکٹر کو لے آؤ۔" اس بار آدم خان نے وضاحت سے کہا۔ "گاڑی تو ہے نا تمہارے پاس؟"

"ہاں۔ لیکن گاڑی کے ذریعے جانا ناممکن ہے۔" صغریٰ نے کہا۔ "درخت نے سڑک روکی ہوئی ہے۔ یوں بھی اس موسم میں چار میل کا یہ فاصلہ کار سے طے نہیں کیا جاسکتا۔"

مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "نذیر خان کے گھر پر بھی تو فون ہے۔"

"ہاں۔" جہانگیر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پیدل جاؤں گی۔"

"فاصلہ چھ میل کے قریب ہے۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ تم کار لے کر سہراب پور ہی چلی جاؤ۔ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ہی لے آنا۔"

"لیکن دریا چڑھ چکا ہو گا' سڑک زیر آب ہو گی۔" میں نے احتجاج کیا۔ "میں کسی نہ کسی طرح نذیر کے گھر پہنچ ہی جاؤں گی۔"

"اوہ...... بات بن گئی۔" صغریٰ نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ گھوڑے پر بیٹھ کر چلی جائیں۔ جلدی بھی پہنچ جائیں گی۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" جہانگیر نے تائید کی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر نظر آیا۔ شاید اُسے خیال آ گیا کہ میں گھڑ سواری نہیں کر سکتی۔ اس نے کن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم آدم کے گھوڑے پر چلی جاؤ۔ وہ تمہیں تنگ بھی نہیں کرے گا۔"

یہ سن کر مجھے احساس ہوا کہ میرا خدشہ غلط تھا۔ جہانگیر کو کم از کم اس وقت یہ خیال

ہرگز نہیں تھا کہ میں گھڑسواری نہیں کر سکتی۔

اندر سے آدم نے پکارا۔ "روشنا...... اصطبل کا دوسرا دروازہ کھولنا۔ وہاں میرا گھوڑا موجود ہے۔ تمہیں پتا ہے' زین وغیرہ کہاں رکھی ہو گی۔"

میری اور جہانگیر کی آنکھیں ملیں۔ اس بار ان میں حیرت تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ "ہاں...... مجھے معلوم ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"محتاط رہنا روشنا۔ وہ طوفان میں بہت جلدی بھڑک اٹھتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو آدم۔" میں نے کہا۔ مجھے احساس تھا کہ جہانگیر مجھے گھور رہا ہے۔

☆=====☆=====☆

اصطبل کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے ذہن سے ہر فکر جھٹک دی۔ میں نے لائٹ آن کی اور ہاتھ بڑھا کر زین اٹھالی۔ پھر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور آدم کے گھوڑے کو بغور دیکھا۔ میں چاہتی تھی کہ گھوڑا مجھ سے مانوس ہو جائے۔ وہ چوکنے انداز میں کان کھڑے کیے ہوئے تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے باتیں کیں۔ کچھ دیر بعد وہ یوں ہنہنایا جیسے میری سرگوشیوں کا جواب دے رہا ہو۔ میں اس کے باکس میں داخل ہو گئی۔ وہ بندھا ہوا نہیں تھا۔

اس نے اپنا سر اٹھایا۔ میں اس کی گردن سہلانے لگی۔ اس نے سر جھکا لیا اور ہنہنانے لگا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے رستم۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔" جواب میں رستم پھر ہنہنایا۔ میں نے اس پر زین لادی اور باگیں تھام کر اُسے باہر لے آئی۔ باہر نکل کر میں اس پر سوار ہوئی اور اسے دریا کی طرف دوڑا دیا۔ دریا کے بہاؤ میں بے حد تندی تھی۔ دریا کو دن کے روشنی میں عبور کرنا بھی آسان نہیں تھا جبکہ مجھے اندھیرے میں یہ کام کرنا تھا۔ جس جگہ سے مجھے دریا عبور کرنا تھا' وہاں دریا کا پاٹ زیادہ نہیں تھا لیکن بہاؤ ایسا تھا کہ چٹانوں کے قدم اکھڑ جائیں۔ پھر مجھے وہ مقام بھی یاد نہیں تھا' جہاں سے دریا پار کرنا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ گھوڑے کو دریا کے کنارے کنارے دوڑاتی رہوں۔

بالآخر وہ مقام آگیا' جہاں سے مجھے دریا عبور کرنا تھا۔ وہاں دریا کا پاٹ بمشکل کسی عام نالے جتنا تھا۔ گہرائی بھی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے باگوں کو جھٹکا دیا۔ رستم ٹھہر گیا۔ میں نے دوبارہ جھٹکا دے کر اسے دریا میں اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہچکچایا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا' وہ پلٹ کر بھاگ کھڑا ہو گا۔ میں نے بڑی نرمی سے پھر جھٹکا دیا۔ رستم ایک قدم بڑھا پھر

جھجکنے لگا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ رستم کے اگلے پاؤں پانی میں تھے۔ اس کے کان گردن سے چپک گئے۔ وہ برہمی سے ہنہنایا لیکن اگلے ہی لمحے وہ پانی میں اُتر گیا۔

وہ بہاؤ میں آڑا ہو کر بڑے گول پتھروں پر سُم رکھتا قدم قدم آگے بڑھا۔ میں اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں انڈیلتی رہی' جو میرا خیال تھا' میں بھول چکی ہوں۔ مگر اس وقت گزرے ہوئے آٹھ برس جیسے ڈھل گئے تھے۔ میں آٹھ برس پیچھے والی روشنا تھی۔ پانی اب رستم کے گھٹنوں تک آ گیا تھا۔ ایک بار وہ ڈگمگایا اور سرد پانی نے مجھے بھگو ڈالا لیکن وہ بڑھتا رہا۔ بہاؤ اتنا تیز تھا کہ مجھے لگتا تھا' کسی بھی لمحے گھوڑے سمیت بہہ جاؤں گی۔

بالآخر رستم نے دوسرے کنارے پر پہنچ کر اپنے سموں سے خشک پگڈنڈی کو چھو لیا۔

پگڈنڈی پر پہنچتے ہی میں نے اسے ایڑ لگائی اور وہ جیسے پرواز کرنے لگا مگر مجھے اس کی وہ برق رفتاری بھی سست محسوس ہو رہی تھی۔ اسے بھی شاید وقت کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ناہموار پگڈنڈی پر اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ جھٹکے اتنے شدید تھے کہ میں کئی بار گرتے گرتے بچی۔ میں اس کی پیٹھ سے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ اب میں پوری طرح گھوڑے پر انحصار کر رہی تھی۔

اور گھوڑا میری توقعات پر پورا اترا۔ اس کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ چند لمحے بعد مجھے نذیر خان کی چراگاہ کی خاردار باڑ نظر آئی۔ پھر مجھے گیٹ نظر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ ایسے ہوا کہ وہ سیاہ خلاء کی مانند نظر آ رہا تھا جس کے پیش منظر میں خار دار تار نہیں تھے۔ میں نے حیرت سے سوچا کہ دروازے پر مویشی نظر آنے چاہئیں تھے۔

میری وہ سوچ لحہ بھر کی تھی۔ رستم پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ فاصلہ کم ہوتے ہی اندھیرا بے معنی ہو گیا۔ مجھے مویشیوں کے نظر نہ آنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ گیٹ کھلا ہوا ضرور تھا مگر اس کے عین سامنے چارہ کاٹنے والی بڑی مشین راستہ روکے کھڑی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے' دور سے وہ گیٹ کے خلاء کا ایک حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ مشین خاصی اونچی اور آٹھ فٹ چوڑی تھی۔

مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ مگر اب رستم کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ دو جستوں میں وہ مشین کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

اس بار سوچنے کا کام میری بجائے رستم نے کیا۔ اسے وہ مشین ایک گڑھے کی مانند نظر آئی ہو گی۔ اس نے اپنی رفتار کم کیے بغیر چھلانگ لگائی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اپنے اور رستم کے انجام سے خوف آ رہا تھا۔

مشین کے اوپر سے گزرنے والا وہ لمحہ مجھے صدیوں پر محیط محسوس ہوا۔ رستم کے سُم زمین سے ٹکرائے تو میں نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دیکھا۔ مشین پیچھے رہ گئی تھی۔ رستم کی چھلانگ ناقابل یقین تھی۔

☆======☆======☆

نذیر خان اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ احاطے میں موجود تھا۔ وہ شاید طوفان کی تباہ کاری کا اندازہ لگانے کے لئے نکلے تھے۔

"ارے.......... یہ تو آدم کا گھوڑا ہے؟" کسی نے کہا۔ "اور یہ روشنا ہے .... زریاب خان کی پوتی۔"

میں نے رستم کی باگیں کھینچیں اور اس کی پیٹھ سے اتر آئی۔ نذیر خان تیزی سے میری طرف لپکا۔ "کیا بات ہے بیٹی؟ خیر تو ہے؟"

مجھے بولنا دوبھر ہو رہا تھا۔ چند لمحے سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے اٹک اٹک کر اسے تمام روداد سنا دی۔

نذیر خان نے بشیر کو میرے بتائے ہوئے نمبر پر ڈاکٹر کو رنگ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے کبیر کو جیپ نکالنے کی ہدایت دی۔ "میں رسیاں، سلاخیں اور ٹارچیں نکالتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے مجھے تسلی دی اور گودام کی طرف چلا گیا۔

وہ لوگ بہت تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کا فون کام کر رہا تھا۔ بشیر، ڈاکٹر کو فون کر کے باہر آیا تو کبیر جیپ نکال چکا تھا۔ پہلی بار مجھے طمانیت کا احساس ہوا۔ نذیر خان اور بشیر نے مل کر چارے کی مشین گیٹ کے سامنے سے ہٹا دی۔

"تم بھی جیپ میں چلو۔ اس موسم میں گھوڑے بڑی آسانی سے بدک جاتے ہیں۔" نذیر خان نے مجھ سے کہا۔

میں ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر میں نے کہا۔ "نہیں چاچاجی۔ گھوڑا کڑے وقت میں کام آیا ہے۔ آتے وقت تیز رفتاری ضروری تھی۔ اب نہیں ہے۔ میں محتاط رہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تو اب چل دو۔"

جیپ آگے بڑھ گئی۔ میں رستم کی پشت پر سوار ہو گئی مگر اس بار سفر دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ بحران گزر چکا تھا۔ اب مجھے کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے جسم کے عضلات

جیسے بے جان ہو گئے تھے۔ میں رستم کی پیٹھ پر اتنے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی تھی کہ ایک معمولی سا جھٹکا بھی مجھے گرانے کے لیے کافی تھا لیکن اس بار رستم بڑے ہموار انداز میں دوڑ رہا تھا۔ اس کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس بار دریا عبور کرتے ہوئے بھی وہ نہیں گھبرایا حالانکہ میری پیار بھری سرگوشیوں سے محروم تھا۔ شاید اسے میری گھبراہٹ اور نڈھال ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ اس بار وہ خود مجھے بہ حفاظت منزل پر پہنچانے والا تھا۔

شاید تن آسانی اور سہولت کے احساس کی وجہ سے دریا عبور کرتے ہی میری سوچیں بے قابو ہو گئیں۔ میرا دل گرے ہوئے کانچ میں جا اٹکا۔ کہیں آدم کو کچھ ہو نہ گیا ہو! یہ ایک خیال رہ رہ کر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا بچے گا زندگی میں۔ ایسے بے وقوف بھی ہوتے ہیں جو زندگی میں اپنی سب سے بڑی حماقت کو دہراتے ہیں۔ میں نے آٹھ سال پہلے ایک حماقت کی تھی اور آج صبح اسے دہرایا تھا۔ ایسے لوگوں کو زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملتا۔ اب میرے لیے اپنی حماقتوں کی تلافی کی یہی ایک رات تو تھی اور مجھے ڈر تھا کہ قسمت ناشکرے پن کی پاداش میں مجھ سے یہ موقع چھین لے گی۔ اگر خدانخواستہ آدم کو کچھ ہو گیا تو .... تو؟

گھوڑا رک گیا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ ہم اصطبل کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے پیار سے اس کی گردن تھپتھپائی اور نیچے اتر آئی۔ میں نے اصطبل کا دروازہ کھولا۔ رستم اندر چلا گیا۔ اسی وقت کلثوم بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ "میں ٹاپوں کی آواز سن کر آئی ہوں۔ کیا ہو رہا ہے روشنا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے مختصراً سب کچھ بتایا اور راشد کے لیے بستر لگانے کی ہدایت دی۔ "میں گھوڑے کو چارہ دے کر آتی ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چونکی اور حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی رستم کو دیکھتی رہی۔ "ہاں.......... میں رستم پر سوار ہو کر مدد لینے گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "گھوڑے میرے لیے کبھی کوئی پریشان کن مسئلہ نہیں رہے۔"

میں اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر اصطبل میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد اس کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے لائٹ آن کی اور رستم کو اس کے باکس میں لے گئی۔ پھر میں نے اس پر سے زین اتاری اور دیوار پر لٹکا دی۔ اس کے بعد میں نے اس کے سامنے چارے کا برتن رکھ دیا۔ وہ بڑی رغبت سے چارے پر منہ مارتا رہا۔ کبھی کبھی وہ

سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں اس کا جسم صاف کرنے کے لیے برش اٹھا لائی۔ میں بہت تھکی ہوئی تھی۔ مگر اسے یوں پسینے میں نہایا ہوا چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔

میں نے اپنی بائیں ہتھیلی اس کی گردن پر رکھی۔ اس لمحے میں نے اس کی گردن کے عضلات میں تناؤ محسوس کیا۔ اس نے چارے سے سر اٹھایا اور وحشت بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی دم تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ وہ نروس محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اصطبل کے دروازے میں تاریک رات کے پیش منظر میں جہانگیر کھڑا نظر آیا۔ وہ تنہا تھا۔ پھر وہ دبے قدموں اصطبل میں داخل ہوا اور اس نے اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک ہی خیال آسکتا تھا۔ میں سیدھی کھڑی ہوئی اور اس سے پوچھا۔ "خیر تو ہے؟"

"اسے نکال لیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم اچھی گھڑسوار ثابت ہوئیں۔ مبارک ہو۔"

"میں پوچھ رہی ہوں' سب ٹھیک ہیں نا؟" میں نے جھنجلا کے کہا۔

اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "راشد کو بچالیا گیا ہے۔"

"تو تم یہاں اس طرح کیوں آئے ہو؟ تمہیں راشد کو گھر پہنچانا چاہیے۔"

وہ مجھ سے نظریں چراتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر کیل سے لٹکی ہوئی نعل اتار لی۔ وہ چند لمحے اسے اپنے ہاتھوں میں تولتا رہا۔ پھر بولا۔ "مجھے افسوس ہے شہتیر گر گیا تھا۔"

میں احمقانہ انداز میں اس کے لفظ دہراتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں بری طرح چونکی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "آدم......... شہتیر......... تم جھوٹ بول رہے ہو جہانگیر۔" اس نے تیز نظروں سے مجھے اور پھر اپنے ہاتھوں میں موجود نعل کو دیکھا۔ "وہ نہیں بچ سکا۔ میں اسے کہتا رہا کہ نکل آؤ مگر وہ راشد کو چھوڑ کر باہر آنے پر رضامند نہیں ہوا۔ شہتیر اس کے اوپر گرا۔ وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکا۔ ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہاں میرے اور صغریٰ کے سوا تھا ہی کون۔ اس وقت تک مدد نہیں پہنچی تھی۔"

یعنی یہ اس وقت کی بات تھی' جب میں واپس آ رہی تھی......... "مدد پہنچنے سے پہلے! بہت خوب۔" میرا لہجہ اس قدر تند تھا کہ گھوڑا بھڑک گیا۔ "یہ سب کچھ تمہارا کیا

دھرا ہے جہانگیر۔ تم......... تم اسے مُردہ دیکھنا چاہتے تھے۔ تم نے دانستہ شہتیر گرنے دیا ہوگا۔"

"پاگل ہوگئی ہو؟ میں اُسے کیوں مُردہ دیکھنا چاہوں گا۔"

"وجہ تو میں نہیں جانتی۔ میں تو اب تک یہ بھی نہیں سمجھ سکی ہوں کہ تمہارا دماغ کس انداز میں کام کرتا ہے۔ شاید......... جیسے راشد کو بچانا تمہارے مفاد میں تھا' اسی طرح آدم کا ختم ہو جانا بھی تمہارے مفاد میں ہوگا۔ تم اتنے خود غرض ہو کہ تمہیں اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ تمہاری ہوس ختم ہونے میں نہیں آتی۔ تم خود کو بہت طاقت ور اور بااختیار سمجھتے ہو۔ ہر قاتل یہی سمجھتا ہے۔ تم مجھے بتا رہے تھے کہ راشد بچ گیا ہے اور آدم........." میں کہتے کہتے رک گئی۔ پھر میں نے تند لہجے میں کہا۔ "تم نے اُسے مرنے دیا......... جبکہ میں وہاں موجود نہیں تھی۔"

کوئی بیس سیکنڈ بعد مجھے اس خاموشی کا ادراک ہوا۔ وہ غیر معمولی سنگین......... اور بولتی ہوئی خاموشی تھی۔ میں نے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ نعل اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "تو خان بابا کے کمرے میں جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور دیکھ کر سوچا تھا' درست تھا لیکن مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اس وقت تک نہیں آیا' جب تک تم نے گھڑسواری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ روشنا......... جاناں......... تم نے مجھے خوب بے وقوف بنایا۔"

جہانگیر ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ رستم نے چوکنا ہو کر سر اٹھایا۔

"تم نے ہم سب کو ہی بے وقوف بنایا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ تم آدم کے عشق میں گرفتار ہو۔ جب تمہیں زاریہ کی موت کا علم ہوا تو تم نے سوچا کہ یہ منزل مُراد پانے کا بہترین موقع ہے۔"

"یہ سچ نہیں ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تم مجھے نظرانداز کرتی تھیں تو میں سوچتا تھا کہ درمیان میں کوئی ہے ضرور۔ تو وہ آدم خان تھا۔ تمہارے لئے اپنے کزن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ تو محض تمہارا مزارع تھا......... ملازم........." اس کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں یہ ایک بات کبھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ جہانگیر رقابت کی آگ میں جلتا رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے مجھ سے محبت تھی' صرف اس لیے کہ میں نے اسے نظرانداز کر کے کسی اور سے محبت کی تھی۔ اسی لیے اس نے

میرے حاملہ ہونے کی داستان گھڑی تھی۔ وہ علاقے کے لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ میں جو بظاہر اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی' درحقیقت اس سے چھپ چھپ کر ملتی تھی۔ یہ اس کی انا کا مسئلہ تھا اور اس انا کی خاطر اس نے دادا جی کی ناراضی کا خطرہ مول لینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

وہ ایک قدم اور بڑھ آیا۔ "تم نے سوچا تھا' وہ تم سے شادی کرلے گا۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اسی لیے واپس آئی تھیں نا تم؟ اس نے پہلی شادی بھی دولت سے کی تھی' کسی عورت سے نہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟" وہ اور آگے بڑھ آیا۔

رستم کا انداز ایسا تھا' جیسے وہ کسی بھی لمحے بھڑک جائے گا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو ارتعاش واضح طور پر محسوس ہوا۔ "لیکن جہانگیر........." میں نے کہنا چاہا۔ میں اسے بتا دینا چاہتی تھی کہ مجھے دولت سے......... فارم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فارم مبارک ہو۔ میرے لیے ماں کی چھوڑی ہوئی رقم بہت کافی ہے۔ میں نے پلٹ کر رستم کو دیکھا اور التجائیہ لہجے میں جہانگیر سے کہا۔ "سنو' اس وقت چلے جاؤ یہاں سے۔ اگر چاہو تو یہ سب کچھ بعد میں کرلینا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

"ہاں۔ میں سمجھتا کیوں نہیں۔" اس نے دہرایا۔ اس کے لہجے نے پہلی بار مجھے سنگینی کا احساس دلایا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "تمہارا خیال ہے' اب بھی میں تم پر اعتماد کروں گا۔ تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ میں ناقدرا نہیں ہوں۔ موقع مل جائے تو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ یہ موقع بھی نہیں گنواؤں گا۔ کلثوم گواہی دے گی کہ میں اس کے ساتھ تھا۔ سب حیرت کریں گے کہ روشنا بالآخر ایک گھوڑے کے ہاتھوں ہلاک ہوئی۔" اس نے باکس کا گیٹ کھولا اور اندر آگیا۔ "سمجھ رہی ہو نا تم؟"

میرے جواب دیتے ہوئے حواس جو بات نہیں سمجھ سکے' وہ جبلت نے مجھے سمجھا دی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹی مگر آہنی جنگلے نے مجھے زیادہ پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔ جہانگیر نے لائٹ آف کر دی۔ اصطبل میں اندھیرا ہو گیا۔ میں خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ کوشش کے باوجود مجھ سے اپنی جگہ سے نہیں ہلا گیا۔ مجھے جہانگیر سائے کی طرح اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں نعل تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ شاید میری کلائی تھامنے کے لیے۔ میرے ذہن میں آدم کے کہے ہوئے الفاظ شور مچا رہے تھے۔

موت زندگی سے آسان بھی ہے اور مہربان بھی' شاید میں نے یہ الفاظ بہ آواز بلند ادا بھی کر دیے۔ جہانگیر کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ اس نے نہایت سختی سے میری کلائی تھامتے ہوئے کہا۔ "بے وقوف......... وہ مرا نہیں ہے۔ میں نے تمہاری شناخت مکمل کرانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔"

اس کا نعل والا ہاتھ بلند ہوا۔ میں پوری قوت سے چیخی اور جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ جہانگیر لڑکھڑایا۔ میری کلائی اس کی گرفت سے نکل گئی۔ میں جلدی سے جھکی اور رستم کے پیٹ کے نیچے رینگ گئی۔ جہانگیر اپنے نعل والے ہاتھ کو نہیں روک سکا۔ نعل رستم کے لگی۔ رستم بہت زور سے چیخا۔ ساتھ ہی وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور اس نے اپنے دونوں اگلے سم جہانگیر کے سینے پر رسید کیے۔ جہانگیر گرا۔ گھوڑے کے سم مشینی انداز میں حرکت کرتے رہے۔ میری نگاہوں کے سامنے سرخ پردہ سا تن گیا۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ لوگوں کو جہانگیر کی چیخوں نے اصطبل کی طرف متوجہ کیا۔ آدم اس سے پہلے ہی اصطبل کی طرف آرہا تھا۔ اس نے اصطبل میں داخل ہو کر روشنی کی تو اس کی نظر جہانگیر کے کٹے پھٹے جسم پر پڑی۔ وہ اپنے خون میں نہایا پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک نعل پڑی تھی۔ میں رستم کے قدموں میں بے ہوش پڑی تھی اور وہ میرا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔

☆======☆======☆

میری آنکھیں کھلیں مگر نظر دھندلائی ہوئی تھی۔ اپنے بہت قریب مجھے آدم کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور اصطبل سے نکال لایا۔ میرا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ وہ مجھے دلاسے دے رہا تھا۔ "گھبراؤ مت۔ سب ٹھیک ہے........." اس نے مجھے باہر لٹا دیا۔

"آدم.........! تم......... زندہ ہو نا؟"

"ہاں۔ اور راشد بھی خیریت سے ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"جہانگیر کا کیا ہوا؟"

"وہ مر چکا ہے۔"

"وہ......... وہ مجھے قتل کرنے والا تھا۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"تقریباً کر ہی دیا تھا۔ مجھے تو پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ رستم نے تمہیں بچالیا۔"

"تو......... تو تمہیں معلوم تھا؟"

"میں نے اندازہ لگالیا تھا۔ پرانا سسٹم پھر سے کام کرنے لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا' جیسے تم مجھے پکار رہی ہو۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جہانگیر موجود نہیں تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے معلوم تھا' تم گھوڑے کا جسم صاف کیے بغیر گھر نہیں جاؤ گی۔ میں اصطبل کی طرف بھاگا مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو.........؟"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی........."

اس وقت قدموں کی آواز سنائی دیں اور کچھ لوگ اس طرف آتے دکھائی دیے۔ آدم نے مختصراً انہیں جہانگیر کی موت کے بارے میں بتایا۔ "وہ شاید روشنا کو بتانے آیا تھا کہ مجھے اور راشد کو بچالیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ لڑکھڑایا ہو گا اور رستم بھڑک گیا ہو گا۔ روشنا دہشت کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے اب ہوش آیا تھا۔" اس نے جہانگیر کا پردہ رکھ لیا۔

☆======☆======☆

اگلی شام میں اور صغریٰ تباہ شدہ صنوبر کے پاس کھڑے تھے۔ میں صغریٰ کو اب تک کے تمام واقعات بتا چکی تھی۔ ہم خاموش کھڑے دادا جی......... ان کی شفقتوں اور محبتوں کو یاد کرتے رہے۔

"بے چارہ درخت۔" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "درخت کیا......... یہ تو اس عہد کی علامت تھا' جو بیت چکا۔"

صغریٰ کے منہ سے ہلکی چیخ نکلی۔ وہ گرے ہوئے درخت کے پاس اکڑوں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ درخت کا کھوہ والا حصہ باہر ہی تھا۔ اس نے کھوہ میں ہاتھ ڈالا اور بہت گہرائی میں کچھ ٹٹولنے لگی۔ میں نے دل میں سوچا۔ اب یہ لیٹر بکس اجڑ چکا۔ اب تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا گڑیا لیکن صغریٰ کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں کچھ دبا ہوا تھا۔ وہ بے حد پُرجوش نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ پھر اس نے مٹھی کھول کر گرد آلود' بوسیدہ لفافے کو بہت غور سے دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خط ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے صغریٰ۔ یہاں ہمارے سوا کوئی خط........."

اس نے خط میری طرف بڑھا دیا۔ میں کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے لفافے کو گھورتی رہی۔ اس پر لکھے ہوئے حروف میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ آنکھوں میں نہ جانے کیوں پانی اتر آیا تھا۔ وہ جانی پہچانی تحریر......... میں تو بغیر پڑھے اس خط کا مضمون بھی بتا سکتی تھی۔ لفافے کی پیشانی پر ذاتی تحریر تھا۔ نیچے آدم کا پتا تھا۔

"باجی......... اس روز پوسٹ مین مجھے راستے ہی میں مل گیا تھا۔" صغریٰ کہہ رہی تھ اور میں خواب کی سی کیفیت میں سن رہی تھی۔ "پوسٹ مین ہمیشہ گھر کی ڈاک مجھے دے دیتا تھا۔ اس روز بھی اس نے یہ خط مجھے دے دیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ حویلی کا خط ہے۔ آدم خان کو دے دینا اور باجی......... میں آپ کی تحریر پہچانتی ہوں اور یہ بھی جانتی تھی کہ آپ اور آدم خان خطوں کا تبادلہ آکاش بیل والے صنوبر کے درخت کے ذریعے کرتے ہیں' اس کھوہ میں خط رکھتے ہیں۔ سو میں نے یہ خط بڑے احترام اور تقدس سے لا کر کھوہ میں رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آدم بھائی آئیں گے اور یہ خط نکال لیں گے۔ میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں تھا اور پھر باجی' میں اسے بھول ہی گئی۔ اس دن کے بعد آج مجھے یاد ہے یہ خط۔ میں نے یہ خط بہت گہرائی میں رکھا تھا۔"

"ظاہر ہے۔ میرے جانے کے بعد آدم نے اس کھوہ کو کبھی ٹٹولا بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"باجی......... کیا یہ خط بہت اہم تھا؟"

میں نے پہلے خط پر......... اور پھر محبت کے رازوں کے اس مردہ درخت پر نظر ڈالی۔ میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ اگر یہ خط آدم کو اسی وقت مل جاتا تو کیا ہوتا؟ اگر آدم بھی شہر آجاتا تو اس کی اپاہج بیوی پر کیا گزرتی اور میں......... میں اپنی نظروں میں ہمیشہ گری رہتی۔ میں اپنی عزت کبھی نہ کرپاتی۔ نہیں......... جو کچھ ہوا تھا' بہتر ہی ہوا تھا۔

"صغریٰ حیران پریشان مجھے دیکھ رہی تھی۔ "کاش.........! کاش میں نے یہ حماقت نہ کی ہوتی۔ یہ خط آدم بھائی کو دے دیا ہوتا۔ باجی......... یہ مجھے دے دیں۔ میں خود آدم بھائی کو دوں گی یہ خط۔ انہیں سب کچھ بتا کر ان سے معذرت بھی کرلوں گی۔ یہی بہتر ہے نا؟"

میں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "آج میری آدم سے ملاقات ہو گی۔ میں خود دے دوں گی اسے یہ خط۔"

"شکریہ باجی۔" وہ خوش ہو گئی۔ "میری طرف سے معذرت بھی کر لیجئے گا۔ کاش.......... اس سے کچھ فرق نہ پڑا ہو۔"

"اس وقت ممکن ہے' کچھ فرق پڑ جاتا۔ اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے طمانیت سے کہا۔

☆======☆======☆

وہ منظر حقیقی نہیں' لینڈ اسکیپ کی کسی پینٹنگ کا حصہ لگ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا' جیسے میں خود بھی اس پینٹنگ میں موجود کوئی فگر ہوں۔ سر پر چمک دار نیلگوں آسمان کی چادر تھی۔ بادل یوں ٹھہرے ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں زمین اور آسمان کے درمیان ٹانک دیا ہو۔ سامنے نیلگوں پہاڑیاں تھیں جنہوں نے آسمان کا رنگ اوڑھ لیا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں سبز مخملیں چراگاہیں تھیں۔ ایک طرف جھیل کا آئینہ خانہ تھا۔ جو بڑی دیانت داری سے ہر رنگ منعکس کر رہا تھا۔

مجھے وہ سب کچھ بے حد اپنا اپنا سا لگا۔ وہاں میرے اور دو سوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں اس وقت خود کو روئے زمین کی پہلی اور واحد عورت سمجھ رہی تھی' جو دھوپ میں بیٹھی اپنے آدم کے تصور میں کھوئی ہو۔ کیسا بے کراں سکون تھا۔

"رُوشنا..........!" عقب سے' بے حد قریب سے کسی نے پکارا۔ میں چونکی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا.......... میرا آدم میرے سامنے کھڑا تھا۔

☆=====☆=====☆

دھند اور دھنک

قدرت نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ کچھ انسانوں میں خصوصی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایک ایسی دوشیزہ کی داستان جسے ورثے میں ایک عجیب و غریب صلاحیت ملی تھی لیکن وہ نعمت اس کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بن گئی تھی۔

آگہی کے کرب میں گرفتار ایک دوشیزہ کی داستان حیرت!

کار شہر کی حدود سے خاصی دور نکل آئی تھی۔ اب سڑک کے دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور سامنے ہری بھری پہاڑیاں۔ صرف ایک شخص کو علم تھا کہ وہ شہر سے نکل آئی ہے۔ صرف ایک شخص کو علم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن وحشت اب بھی اس کے وجود میں موجیں مار رہی تھی۔ کوئی ان دیکھا ہاتھ اسے اپنے کندھے چھوتا محسوس ہو رہا تھا۔

نیلما کو خواب دیکھنے کا گمان گزرنے لگا۔ خواب میں بھی تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ کوئی اس کا تعاقب کرتا تھا لیکن اب وہ اسے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں وہ شام نگر پہنچ جاتی۔ ماجی خالہ کے پاس' اور دل کا تمام درد ان کی سماعت میں انڈیل کر ہلکی پھلکی ہو جاتی۔ اتنی بے تکلفی وہ مما کے ساتھ نہیں برت سکتی تھی۔

اس نے ماجی خالہ کو فون کیا تھا تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ میرے پاس آ جاؤ۔ اور نیلما فوراً ہی پُرسکون ہو گئی تھی۔ مما کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مما سے تو نو مہینوں سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ ماں بیٹی کے درمیان وہ دوری بے حد تکلیف دہ تھی لیکن نیلما اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ماں کی ہربات نظرانداز کر کے اپنے راستے پر خاموشی سے بڑھتے رہنا ہے۔

ویسے بھی مما کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے' انہیں معلوم کرنا ہو گا تو وہ ایک لمحے میں معلوم کر لیں گی۔

اب کار سُست روی سے چڑھائی پر چڑھتی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک جانب پہاڑ تھے۔ دھند میں لپٹے ہوئے نیلگوں پہاڑ۔ دوسری جانب کھائیاں تھیں جن میں جا بجا جنگلی گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔ فضا میں جنگلی پھولوں اور تازہ ہوا کی مہک تھی۔ نیلما کو تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ نیلگوں پہاڑ اور سرسبز وادیاں بانہیں وا کئے اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔

نیلما کے لئے ماجی خالہ ہی ماں تھیں۔ بچپن سے مما کی جگہ انہوں نے ہی اسے پالا

تھا۔ اس کی نگہداشت کی تھی۔ مما کو تو شہرت کی آرزو اِدھر اُدھر اڑائے لئے پھرتی تھی۔ اُن کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔ اِن دنوں بھی انہیں ٹی وی پر اسٹیج شوز میں مدعو کیا جاتا' کانفرنسوں میں بلایا جاتا' جہاں وہ اپنی خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کرتیں۔ ملک بھر میں ان کے پرستار لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ نیلما کو مما کی شہرت سے خوف آتا۔ وہ تو شکر تھا کہ مما اپنا آبائی نام شبنم نفیس استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ نیلما ظفر اپنے ساتھ اس باپ کا نام لگا کر محفوظ تھی' جس کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ جس کی صورت بھی اُسے یاد نہیں تھی۔

اب ماجی خالہ بھی برسوں سے دور تھیں۔ یوں نیلما سے اکلوتا راز دار بھی چھن گیا تھا۔ پچھلے دو سال میں اس پر کیا گزری' یہ اس نے ماجی خالہ کو بھی نہیں بتایا تو کسی اور کو کیا بتاتی لیکن مما نے بغیر کہے ہی جان لیا تھا اور کہا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ اس پر نیلما نے چیخ کر کہا تھا مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں مما۔ اور مما نے غیر متوقع طور پر اس کے اس حق کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب ماجی خالہ کے پاس شام نگر جاتے ہوئے نیلما کو یہ سوچ کر سکون کا احساس ہو رہا تھا کہ انہیں بھی سب کچھ معلوم ہو گا۔ وہ اس کی مدد کریں گی۔ اس کے لئے راستے کا تعین کریں گی۔

مما کو تو ہمیشہ سے یہی امید تھی کہ ان کا قیمتی ورثہ' آبائی تحفہ ان کی بیٹی کو ضرور منتقل ہو گا۔ جس وقت ابتدائی علامات نمودار ہوئیں' نیلما پانچ سال کی تھی۔ اسے یاد تھا مما بہت خوش' بہت ایکسائٹ ہوئی تھیں لیکن نیلما کو پہلے ہی لمحے سے اس ورثے' اس تحفے سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

نیلما اس پہلے تجربے کو کبھی نہیں بھول سکی۔ وہ لمحہ تھا ہی اتنا سنسنی خیز۔ اس کی نگاہوں سے سامنے کا منظر اوجھل ہو گیا تھا اور اسے اپنی پیاری بلی مانو سڑک پار کرتی نظر آئی تھی۔ پھر تیزی سے آتی ہوئی ایک کار نے مانو کو کچل ڈالا تھا۔ نیلما کو اسی لمحے یہ علم بھی ہو گیا تھا کہ یہ حادثہ کس سڑک پر ہوا ہے اس نے روتے سسکتے ہوئے مما کو بتایا تھا اور مما نے ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا تھا۔ انہوں نے نیلما کو دلاسا بھی دیا تھا لیکن وہ اس خوشی کو نہیں چھپا سکی تھیں' جو انہیں اپنی آبائی خدادا صلاحیت اپنی بیٹی میں منتقل ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ نیلما نے اس وقت بھی چیخ چیخ کر ایک شکوہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے پہلے نظر کیوں نظر نہیں آیا۔ ورنہ میں اپنی مانو کو بچا لیتی۔

بعد کے برسوں میں آبائی تحفے نے اُسے بچائے رکھا۔ اس نے خود بھی ہمیشہ اس

سلسلے میں سوچنے سے گریز کیا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ پھر اسے وہ کام بھی مل گیا' جو اسے پسند تھا۔ وہ بھائی بہنوں کی نعمت سے محروم تھی۔ شاید اسی لئے بچّے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ کتابوں سے بھی محبت کرتی تھی۔ ماجی خالہ نے اس کی دونوں محبتوں کو یکجا کر دیا۔ اسے ماڈل گرامر سکول کی لائبریری میں ملازمت ملی تو وہ بہت خوش ہوئی۔

اس ملازمت کے دوران نیلما پر اپنی ایک اور صلاحیت منکشف ہوئی۔ وہ بچوں کو کہانی سنانے کے فن سے فطری طور پر آشنا تھی۔ اس کی آواز نرم اور واضح تھی۔ لہجہ سچویشن کے اعتبار سے خود بہ خود اتار چڑھاؤ اختیار کرتا تھا۔ کہانی سننے والے بچّے مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔

بچّے قدرتی طور پر کہانی سے قریب ہوتے ہیں اور آج کل کے مشینی دور میں والدین کو کہانی سنانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ جن خوش نصیب بچوں کے دادا دادی یا نانا نانی زندہ ہوتے ہیں' انہیں تو کبھی کبھار کوئی کہانی نصیب ہو ہی جاتی ہے لیکن اکثریت محرومین ہی کی ہے۔

چنانچہ اس کا جادو سرچڑھ کر بولا۔ بچّے اپنے گھروں میں اس کے اور اس کی قصہ گوئی کے متعلق بتاتے۔ پھریوں ہونے لگا کہ کبھی کسی کے گھر' کبھی کسی کے گھر بچّوں کے اجتماع ہونے لگے۔ اسے ان اجتماعات میں کہانی سنانے کے لئے بلایا جانے لگا۔ وہ ان سرگرمیوں سے خوش تھی لیکن مما خفا تھیں ان کے نزدیک وہ اپنی اصل خداداد صلاحیت کو جلا بخشنے کے بجائے فضولیات میں اپنا وقت اور اپنی خداداد صلاحیت دونوں کو ضائع کر رہی تھی۔

پچھلے دنوں ماجی خالہ نے ستارہ جاوید کی بچوں کی کہانیوں کی کتاب سرخ سڑک' کے اسکیچ بنائے تھے تو نیلما کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ ستارہ' ماجی خالہ کی قریبی دوست تھی۔ اس کا انتقال حال ہی میں ہوا تھا اور نیلما کے نزدیک وہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ ماجی خالہ اور ستارہ کے فن کا اشتراک ختم ہو گیا تھا۔

اب وہ شہر کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ شام نگر قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ماجی خالہ' شوہر کے انتقال کے بعد سے وہاں تنہا ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے مما کے اصرار کے باوجود شہر واپس آنا قبول نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کے درمیان وہ فطرت اور زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔

نیلما مدتوں سے شام نگر آنے کی خواہش مند تھی لیکن ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے

اسے ارادہ ملتوی کرنا پڑ جاتا لیکن تازہ ترین واقعے نے نیلما کو احساس دلا دیا تھا کہ اب غائب ہو جانا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اسے خوف ناک حالیہ واقعات کی اس زنجیر سے خود کو علیحدہ کر کے فرار ہو جانا ہی مسائل کا بہترین حل محسوس ہوا۔ اب وہ ایسے مقامات سے دور ہی رہنا چاہتی تھی' جہاں تشدد کے واقعات ہوتے ہوں۔ جہاں اس کی مستقبل بینی کی صلاحیت کو تحرک اور جِلا ملتی ہو۔ اس نے سوچا تھا' شام نگر میں اس کی صلاحیتوں کو جگانے والا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو گا اور وہ اس صلاحیت کو بہ آسانی ماضی کے دھندلکوں میں دھکیل سکے گی۔

اب وہ دوراہا آ رہا تھا' جس کے متعلق ماجی خالہ نے بتایا تھا۔ اسے داہنی سمت والی سڑک پر جانا تھا۔

اس نے گاڑی اس سڑک پر ڈال دی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اِکا دُکا مکان نظر آنے لگے۔ مکان مخصوص پہاڑی طرزِ تعمیر کے حامل تھے۔ شاہ بلوط کی لکڑی سے بنے ہوئے' چھتوں پر شوخ رنگ پینٹ کئے گئے تھے۔

پھر اُسے ماجی خالہ کی بتائی ہوئی نشانی نظر آئی۔ وہ یقیناً ماجی خالہ کا مکان تھا۔ ایک شخص چھت پر چڑھا مرمت وغیرہ کا کوئی کام کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ روک کر نیلما کو بغور دیکھا۔ جو کار رکنے کے بعد اُتر رہی تھی۔ اس شخص کے لبوں پر کوئی خیر مقدمی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ چوڑے کندھوں والا شخص دونوں ٹانگیں چھت سے لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ ہوا سیاہ بالوں کو اُڑا رہی تھی۔ کچھ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔

نیلما نے اسے سلام کیا اور بولی۔ ”میں نیلما ظفر ہوں......... ماجدہ خالہ کی بھانجی۔“

اس نے سر ایک طرف جھکا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر اس نے سر جھکایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ نیلما نے ڈکی کھول کر اپنا سوٹ کیس اور بیگ نکالا اور چوبی گیٹ کھول کر صحن میں داخل ہو گئی جو لکڑی کے تختوں کا بنا ہوا تھا اور کسی بحری جہاز کے عرشے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔ اسے مزید آگے بڑھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ کاٹیج کا دروازہ کھلا اور ماجی خالہ اس کی طرف لپکیں۔

ماجی خالہ ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔ وہ اب بھی وہی نرم اور مہربان ماجی خالہ تھیں' جنھوں نے کبھی ماں کی مامتا سے محروم بچّی کو سینے سے لگایا تھا.......... سہارا دیا تھا' تحفظ کا احساس دیا تھا۔ وہ کاٹن کی قمیص شلوار میں بے حد سادہ اور پُر وقار لگ رہی تھیں۔ ان کی

عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی مگر وہ چالیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔

انہوں نے لپک کر نیلما کو کسی ننھی سی بچی کی طرح باہوں میں سمیٹ لیا۔ اس کی پیشانی چومی پھر اسے کچھ پیچھے ہٹا کر اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کے بعد بولیں۔ "چلو........ اندر چلو کافی تیار ہے۔" ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھرکی اور ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔

نیلما کو ایسا لگا' جیسے اس کے وجود پر رکھی بھاری چٹان تحلیل ہو گئی ہے۔ اس لمحے اس نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ہفتوں بعد وہ پہلا موقع تھا کہ اس کا ہنسنے کو جی چاہا۔ ماجی خالہ ہمیشہ کہتی تھیں۔ ہمارا آبائی ورثہ مجھے چھو کر گزر گیا ہے' مجھ پر مہربان ہوئے بغیر' لیکن کتنی عجیب بات تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ نیلما کس وقت آئے گی۔ انہوں نے کافی صحیح وقت پر بنائی تھی۔ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی غیر متوقع مہمان آیا ہو اور وقت کے مطابق اس کی تواضع کا اہتمام مکمل نہ ہوا ہو۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم تھا' جس کے آخری حصے میں کھانے کی میز بچھی ہوئی تھی۔ کمرے میں کئی کھڑکیاں تھیں' جن سے سامنے کے بلند و بالا پہاڑوں کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ نیچے سر سبز ڈھلانیں اور مرغزار تھے۔

خالہ نے سوٹ کیس اور بیگ نیلما کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ "فی الوقت انہیں یہیں رہنے دو۔ کچھ دیر بعد میں تمہیں تمہارا کمرا دکھاؤں گی۔ تمہارا کمرا نیچے ہے۔ حیران مت ہو۔ یہاں ایسا اکثر ہوتا ہے زمین کی سطح سے ملی ہوئی پہلی منزل ہوتی ہے۔ نچلی منزل کے لئے زینے طے کرنے پڑتے ہیں۔ نئے آنے والوں کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ دراصل یہ مکان ایک پہاڑی اور اس کی عمودی ڈھلان پر بنایا گیا تھا۔ سامنے والا حصہ بلندی پر بنا ہے۔ اب ذرا یہاں آ کر کھڑکی سے جھانکو۔"

نیلما کھڑکی کے پاس گئی اور اس نے باہر جھانکا۔ اسے سچ مچ چکر آ گئے۔ بغیر سیڑھیاں چڑھے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی عمارت کی دوسری منزل کی کھڑکی سے جھانک رہی ہو۔ اچھا خاصا ہوش ربا منظر تھا۔

"وہ سامنے باتھ روم ہے۔ منہ ہاتھ دھونا چاہو تو دھو لو۔" ماجی خالہ نے کہا۔

نیلما باتھ روم کے دروازے پر رکی اور اس نے پلٹ کر پوچھا۔ "وہ شخص کون ہے' جو چھت پر کام کر رہا ہے؟"

"وہ وقار ہے۔" خالہ نے بتایا پھر پوچھا۔ "اس نے معمول کے مطابق خاموشی سے

سخت نگاہوں سے تمہارا جائزہ لیا ہو گا؟"

"جی ہاں۔"

"اس کی کوئی پروا نہ کرنا۔ اس کی رگوں میں پہاڑی قبائلیوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ حالانکہ اب وہ خون پتلا ہو چکا ہو گا۔ مگر وہ خود کو سخت جان' سخت مزاج' ظاہر کرنا پسند کرتا ہے۔ کچھ بنتا بھی ہے۔"

"ہو گا کچھ۔" نیلما نے کہا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

"دیر نہ لگانا۔ ورنہ کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

نیلما کو اس علاقے میں اتنے جدید طرز کے باتھ روم کی توقع نہیں تھی۔ اس کا دل خوش ہو گیا لیکن وہ کافی کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اس لئے اس نے باتھ روم میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

وہ باتھ روم سے نکلی تو ماجی خالہ کو کھڑکی کے پاس بیٹھا پایا۔ انہوں نے نیلما کے لئے بھی وہیں کرسی رکھ لی تھی۔ کافی ٹیبل پر کافی پاٹ اور دو پیالیاں موجود تھیں۔ نیلما خالی کرسی پر جا بیٹھی۔ منظر بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ سورج اب پہاڑوں کی طرف جھک رہا تھا۔ وہاں اس قدر سکون تھا کہ نیلما کی روح شاداب ہو گئی۔ گزشتہ کئی مہینوں میں اس نے خود کو اتنا پُرسکون محسوس نہیں کیا تھا' جتنا اب کر رہی تھی۔ سر سبز چراگاہوں پر آسمان کی چادر اتنی وسیع و عریض تھی کہ اس کے سائے میں پہاڑ بہت چھوٹے چھوٹے لگ رہے تھے۔

"صلاحیت پھر اُبھر آئی ہے نا تمہاری؟" ماجی خالہ نے یوں پوچھا جیسے پتی اچھلنے کے بارے میں دریافت کر رہی ہوں۔

نیلما نے حیران نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ مسکرا دیں۔ "نہیں........ میری جان۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے خاموش سوال کا جواب دیا۔ "لیکن میں جانتی ہوں کہ کوئی اور بات تمہیں اتنا زیادہ پریشان نہیں کر سکتی۔ دو ایک بار یہ تحفہ مجھ پر بھی حملہ آور ہو چکا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایسے موقعوں پر خود کو ٹوٹتا چٹختا محسوس کیا ہے۔ خوش قسمتی سے میں اس کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے تو عمر بھر کے لئے اس سے چھٹکارا مل گیا۔"

"کاش........ مجھے بھی معلوم ہوتا کہ اس سے کیسے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔" نیلما

نے سرد آہ بھر کے کہا۔ اندر طوفان مچل رہا تھا۔ وہ بھری بیٹھی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ کہاں سے شروع کرے؟

"تم اپنے لائبریری کے کام سے تو مطمئن ہو۔ خوش ہو نا؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

نیلما کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اس نے پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ سکون سے بات کرنے ہی میں بہتری تھی۔ آنسو بہہ نکلے تو وہ جانتی تھی کہ بات کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

"پہلی بار جھماکا ہوا تو کار آمد معلوم ہوا تھا۔" اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کی زندگی تک بچالے گا۔" نیلما کو احساس تھا کہ وہ اپنی بات مؤثر انداز میں بیان نہیں کر پا رہی ہے لیکن اس وقت تو یہ بھی غنیمت تھا۔ "لیکن جو کچھ ہوا' وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس سے مجھے کچھ مقبولیت ملتی۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر گئی تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے نو تعمیر شدہ مکانوں کی طرف چل دیئے لیکن جیسے ہی میں نے اس حصے میں قدم رکھا........" اس سے بات پوری نہ کی گئی۔ دہشت نئے سرے سے اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

"دیکھو........ تم نہ ٹوٹو گی نہ بکھرو گی۔" ماجی خالہ نے اُسے دلاسا دیا۔ "کھڑکی سے پہاڑوں کی طرف دیکھو۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تمہیں پُرسکون کر دیں گے۔" ان کا لہجہ کسی ہپناٹسٹ کا سا تھا۔

نیلما نے کھڑکی سے دیکھا۔ دھوپ کا سنہرا پن ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔ سرخ زمین سبز دھاگے میں لپٹی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف سکون میں لپٹی ہوئی خاموشی تھی۔ وہ خود کو بے حد محفوظ محسوس کرنے لگی۔ اس نے سکون کی سانس لے کر نظریں ہٹائیں اور دوبارہ گویا ہوئی۔ "مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ میں وہاں زمین کے نیچے زہر ابلتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ زہر موجیں مار رہا تھا سطح زمین پر آ کر سب کچھ تباہ کر دینے کو مچل رہا تھا۔ وہاں کے لوگوں کو یہ سب کچھ بتانا ضروری تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے مکانوں کی ایک مختصر سی بستی تھی۔ خبر کیسی ہی سہی' دینا ضروری تھی۔ لوگوں کو متنبہ کرنا تھا۔"

"لوگوں کو تمہاری بات پر یقین آیا؟"

"وہ یقین کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن پھر میں نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی' جہاں زہر نے زمین کا سینہ چیر دیا تھا اور باہر نکل رہا تھا۔ میں نے انہیں وہ جگہ دکھا دی۔ میں معصوم بچوں کی جانیں بچانا چاہتی تھی۔ کسی نے میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ تاہم کچھ لوگ اپنے مکان

چھوڑ گئے۔ باقی وہیں رُکنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت تھی' جیسے زیرِ زمین پلنے والے اس زہر کی میں ہی ذمے دار ہوں۔ انجام کار میری بات درست ثابت ہوئی۔ وہ علاقہ سب کو چھوڑنا پڑا۔ اصل مجرم اس کیمیکل پلانٹ کے مالک تھے' جنہوں نے برسوں پہلے فاضل زہریلے سیال کو اپنی دانست میں ٹھکانے لگایا تھا۔"

"اخبار والوں کو تو اس کی خبر یقینی طور پر ہو گئی ہو گی۔ میرا مطلب ہے' اس معاملے میں تمہارے رول کی؟"

نیلما نے گرم کافی کا گھونٹ لیا۔ جو کچھ ہوا تھا' اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اب بھی اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ جاتی تھی۔ "یہی تو بدترین بات ہوئی۔ لوگوں نے اخباروں میں میرے بارے میں پڑھا اور مجھ سے معلوم کرنا شروع کر دیا کہ کون سا علاقہ مخدوش ہے اور کون سا نہیں۔ کبھی کبھی میں انہیں یہ بھی بتاتی تھی کہ فلاں جگہ کی زمین ٹھیک ٹھاک اور محفوظ ہے۔ ایسے موقعوں پر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی لیکن زیادہ تر میں انہیں بُری خبریں ہی سناتی تھی۔"

"بس..........یا؟ ابھی کچھ اور بھی ہے؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

نیلما کے وجود کی اندرونی تھرتھراہٹ اور بڑھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کافی کا کپ تھام کر ایک گھونٹ اور لیا۔ اس وقت وہ ایک ہاتھ سے کافی کا کپ سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ "ابھی تو بہت کچھ ہے۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "آخری بار جو میں نے زیرِ زمین زہر کا سراغ لگایا' وہ ایک سال پرانی بات ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ میرے لئے اب بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی لیکن اس کا تو کوئی سوئچ بھی نہیں کہ اسے آف کر کے سکون کا سانس لوں۔ یہ نئی بات جب پہلی بار رونما ہوئی تو میرے وجود میں دہشت کی لہر دوڑ گئی لیکن میں نے کھدائی کے لئے بالکل درست مقام کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بلکہ میں نے کسی کو مشورہ دیا تھا کہ پولیس کو بُلا لیا جائے۔" یہ کہہ کر نیلما نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا مگر اس طرح وہ تصور میں ابھر آنے والے منظر کو نہیں روک سکتی تھی۔

"لیکن وہ سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے' جیسے میں پاگل ہوں۔ پولیس انسپکٹر کو تو یقین تھا اس بات کا۔ میری بات پر کسی کو یقین نہیں آیا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی بے یقینی سے عاجز آ کر خود کدال اٹھا لیا اور پہلی ہی بار میں میرا کدال انسانی ہڈی سے ٹکرایا۔ قبر

تھی ہی اتنی گہری۔ پھر کسی نے میرے ہاتھ سے کدال لے لیا اور باقاعدہ کھدائی شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کی لاش نکل آئی۔ اس کی موت کو زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتا چلا کہ اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا تھا اور بعد میں اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا......... میں دہشت زدہ تھی کہ مجھے اس کی قبر کا پتا کیونکر چلا۔ کیوں......... آخر کیوں؟"

ماجی خالہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو بڑی نرمی سے سہلایا۔ "اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے دل پر سے ہر بوجھ اتار پھینکا۔ اب تم ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔"

"شروع میں تو پولیس مجھ پر شک کرتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ میں ملوث ہوں' ورنہ مجھے اتنی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں لیکن پھر مزید تین لاشیں برآمد ہوئیں اور ظاہر ہے کہ اتنی وارداتوں سے میرا تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔"

ماجی خالہ نے ہمدردانہ نگاہوں سے اُسے دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپاتی رہیں۔

"بس پھر والدین اور پولیس میرے پیچھے پڑ گئے۔" نیلما نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جب بھی کوئی نوجوان لڑکی غائب ہوتی' وہ مجھ سے مدد طلب کرتے۔ انجام ہر کہانی کا ایک ہوتا تھا۔ ہر لڑکی کی لاش ملتی تھی اور لاش تک راہنمائی میں کرتی تھی۔ پھر مجھے قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ شاید مجرموں کی طرف سے۔ وہ خوف زدہ ہوں گے کہ کہیں میں پولیس کو اُن تک نہ پہنچا دوں۔"

"مجھے پورا عمل بتاؤ۔ آغاز کیسے ہوتا تھا؟" خالہ نے پوچھا۔

"میری طبیعت مضمحل ہوتی تھی۔ سر میں شدید درد شروع ہو جاتا تھا۔ جگہ کا نام مجھے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ البتہ وہ میرے تصور میں نظر آ جاتی تھی۔ میں اس کا نقشہ بیان کرتی اور کوئی نہ کوئی سمجھ جاتا۔ باقی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ میرا ذہن خالی ہو جاتا تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ پھر نظروں کے سامنے دُھند سی اُبھرتی اور اس دُھند کے عقب سے منظر اُبھرتا۔ پھر پولیس مجھے وہاں لے جاتی تو میں انہیں بڑی آسانی سے اصل مقام بتا دیتی تھی۔ اس سلسلے مجھ سے ایک بار ہلکی سی چُوک بھی نہیں ہوئی۔ بس پھر کھدائی ہوتی اور......... اور......... اور لاش نکل آتی۔" نیلما

اب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تکلیف دہ یادیں جیسے زندہ ہو گئی تھیں۔ جیتی جاگتی یادیں۔ دو اموات حالیہ نہیں تھیں۔ وہاں متعفن باقیات اور ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ منظر بہت ہی خوف ناک تھے اور اس کی یادداشت سے اب تک بھی نہیں مٹے تھے۔ انسپکٹر کو اب اس کی خداداد صلاحیت پر یقین تھا۔ وہ اُسے صورتِ حال کی اذیت ناکی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن وہ سب کچھ اب نیلما کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے اعصاب شکستہ ہو گئے تھے۔

"تو تمہیں اس سلسلے میں کوئی راہنمائی نہیں مل سکی کہ قاتل کون ہے؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ پولیس نے اس سلسلے میں کافی کوشش کی۔ وہ مجھ سے کُرید کُرید کر جزئیات پوچھتے رہے لیکن خدا کا شکر کہ اس سلسلے میں مَیں درست سمت میں ان کی راہنمائی نہیں کر سکی۔ اس کے باوجود دھمکیوں والی کالز نے عاجز کر رکھا ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ کسی دن کوئی سر پھرا کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔ سچ پوچھیں تو میں جان کے خوف سے بھی بھاگی ہوں۔" اس نے پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مرغزاروں پر سائے پھیلنے لگے تھے۔ سامنے والے پہاڑ کے چٹانی چھجے پر ایک لڑکا کھڑا پتنگ اڑاتا نظر آیا۔ "یہاں بہت سکون ہے خالہ۔" خاصی دیر توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ "سب سے زیادہ خوش کن یہ احساس ہے کہ یہاں کوئی مجھے نہیں جانتا۔ کسی کو میری صلاحیت کے متعلق علم نہیں۔ میں ایسی جگہ سے دور رہنا چاہتی ہوں' جہاں جرائم ہوتے ہیں۔ میں ایک عام سی لڑکی رہنا چاہتی ہوں۔"

ماجی نے پھر اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "دیکھو نیلی......... تم نے ان لوگوں کے ساتھ بھلائی کی۔ پریشان والدین کو گومگو کی کیفیت سے نجات دلائی۔ کھلے صدمے سے آدمی بہ آسانی گزر جاتا ہے۔ امید و بیم کی کشمکش اسے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ تم نے ان والدین کی مشکل آسان کی' جنہیں حقیقت کا پتا نہ چلتا تو ساری زندگی اپنی اپنی بیٹیوں کی راہ بے سود تکتے رہتے۔ امید کے کچے دھاگے سے لٹکے مایوسی کی مہیب و تاریک خلاؤں میں جھولتے رہتے۔

"کیا پتا۔" نیلما نے آہ بھر کے کہا۔ "کون جانے' امید ہی بہتر ہوتی ہو۔ ویسے بھی مسئلہ یہ نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھے ہونی کا علم ہونے سے پہلے کیوں نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو میں اسے روکنے کی کوشش تو کر سکوں گی۔"

"یہ مشیت کے کھیل ہیں نیلی گڑیا۔ تمہیں صلاحیت بھی خدا نے دی اور زندگی اور موت پر اختیار بھی صرف اسی کا ہے۔ جو ہونی ہے' وہ تو ہو کر رہے گی۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ تم نے اپنی مانو کی موت پر بھی یہی کہا تھا لیکن یہ سوچو کہ اگر تمہیں پہلے سے علم ہو بھی جائے تو تم انہیں خوف زدہ کرنے کے سوا کیا کرو گی اور پھر وہ تمہاری بات پر یقین بھی نہیں کریں گے۔"

"تو ایسی جگہ رہنا بہتر ہے جہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا ہو۔ اب میں سب کچھ بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ میں یہاں محفوظ ہوں۔"

اِس بار ماجی خالہ نے اس کا ہاتھ بہت زور سے تھپتھپایا۔ "اب تم کافی ختم کرو۔ اپنا سامان نکالو۔ اپنا کمرا سیٹ کرو۔ میں کھانے کی فکر میں لگتی ہوں۔"

نیلما نے چونک کر دیکھا۔ اُسے خالہ کے لہجے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی تھی۔ "خالہ......... یہاں جرائم تو نہیں ہوتے نا؟" اس نے اشتباہ آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ کم از کم میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ البتہ ماضی کے سلسلے میں مَیں ضمانت نہیں دے سکتی۔"

"میں ماضی سے خوف زدہ ہوں بھی نہیں۔ ماضی سے مجھے پیغامات موصول نہیں ہوتے۔ کم از کم اب تک تو ایسا نہیں ہوا۔"

"میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو' ٹھیک ہے بھی ہے یا نہیں۔" ماجی خالہ نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"آپ کا مطلب ہے' میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ تمہاری آمد سے تو مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تمہیں اپنی صلاحیت سے بھاگنے کے بجائے اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اسے فزوں تر کرنا چاہیے۔"

نیلما پھر متفکر ہو گئی۔ اس کا جسم تن سا گیا۔ "کیا مطلب؟" اس نے کشیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تم اپنے ذہن پر مزید بوجھ مت ڈالو۔ پُرسکون ہو جاؤ اور آرام کرو لیکن میرا خیال ہے' اس طرح بھاگنے سے ماضی کے منظر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ البتہ تم اپنی صلاحیت سے فائدہ بھی اٹھا سکتی ہو۔ آدمی کو دنیا میں جس کام کے لئے بھیجا جائے' اُسے وہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہنسی خوشی کرے یا روتے دھوتے' اس سے مفر کسی کو

نہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا؟"

"کیا......... یہاں شام نگر میں بھی کچھ ہوا ہے؟" نیلما نے گھبرا کر پوچھا۔ "کوئی ایسی بات' جو آپ نے مجھے نہیں بتائی۔"

"کوئی ایسی اہم بات ہے تو نہیں لیکن کل بھی ہو سکتی ہے۔" ماجی خالہ نے بے پروائی سے کہا۔

ایک لمحے کو نیلما انہیں دیکھتی رہ گئی۔ تحفظ کا وہ احساس جو یہاں پہنچنے پر اُسے ہوا تھا' نہ جانے کہاں جا سویا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپایا اور بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ وہ آنسو تھے' جو اس نے مدت سے روک رکھے تھے۔ جنہیں اس نے بہنے نہیں دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ بہہ گئے تو اس کے حوصلے کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ وہ ہمت ہار بیٹھے گی اور اب وہ سسک رہی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

ماجی خالہ پریشان تھیں۔ انہوں نے آنسو پونچھنے کے لئے رومال اس کی طرف بڑھایا۔ مگر اسے خاموش کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

نیلما نے باہر کا چوبی گیٹ کھلنے کی آواز سنی تو سر اٹھا کر اپنی آنکھیں پونچھیں۔ پھر قدموں کی آہٹیں ابھریں۔ دروازہ کھلا اور فوراً ہی گویا ایک جسیم ہیولے نے اسے بھیڑ بھی دیا۔ نیلما کو اسے پہچاننے میں کچھ دیر لگی۔ وہ وقار تھا۔

وقار نے ایک نظر نیلما کو دیکھا اور پھر فوراً نگاہیں ہٹا لیں۔ "مداخلت کے لئے معذرت خواہ ہوں بیگم باقر۔" اس نے ماجی خالہ سے کہا۔ "اب اندھیرا ہونے والا ہے۔ میں کام روک رہا ہوں۔ کل کام مکمل کروں گا۔"

"شکریہ وقار۔" ماجی خالہ بولیں۔ "یہ میری بھانجی نیلما ہے......... نیلما ظفر۔ یہ کچھ عرصہ میرے ساتھ ہی رہے گی اور نیلما! یہ ہمارے پڑوسی اور باقر کے بہت اچھے دوست ہیں......... وقار۔ یہ سامنے والی وادی میں رہتے ہیں' پہاڑ کے دامن میں۔"

نیلما اس وقت تعارف کی رسمیات کا خیال نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے محتاط نظروں سے وقار کو دیکھا۔ اُسے یہ احساس بھی تھا کہ وقار کے انداز میں بھی بے اعتباری ہے۔ چھت پر اُس کے ڈیل ڈول کا صحیح اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اب پتا چل رہا تھا۔ وہ بے حد تنومند اور جسیم تھا۔ عمر چالیس سے کچھ کم رہی ہو گی۔ اس کے موسم زدہ چہرے پر عجیب سی سختی تھی۔ یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نظر آتی ہو گی۔ اس کی براؤن آنکھوں میں نیلاہٹ کی جھلک بھی تھی۔

نیلما کی اعصابی کشیدگی خالہ سے مخفی نہیں تھی۔ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں وقار سے کہا۔ "اب جاؤ۔ کل دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔ خدا حافظ!"

وقار نے بھی ان کے لہجے کو محسوس کر لیا۔ "خدا حافظ بیگم باقر۔" اس نے کہا اور رخصت ہو گیا۔

"مجھے اس کے ساتھ اس طرح نہیں پیش آنا چاہئے تھا۔" ماجی خالہ نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "وہ اتنا جان دار اور سخت دکھائی دیتا ہے کہ میں اکثر اس کی حساسیت بھول جاتی ہوں۔ مجھے خیال نہیں رہتا کہ وہ کتنی جلدی کتنی معمولی سی بات پر برا مان جاتا ہے۔"

"مجھے اس سے.......... کچھ عجیب سا لگتا ہے مجھے یہ شخص۔" نیلما نے اعتراف کیا۔ "اس میں کوئی نہ کوئی ایسی غیر معمولی بات ہے جو میں.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر جھنجلا کر بولی۔ "نہیں، میں اس سلسلے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔"

"تو مت سوچو۔ وقار معقول اور ٹھیک ٹھاک آدمی ہے۔ یوں ہر انسان کو ٹٹولنے بیٹھو گی تو اپنی صلاحیت ضائع کرو گی۔ اسے مناسب موقعوں کے لئے بچا کر رکھو۔" ماجی خالہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

نیلما اپنی صلاحیت کو بچا کر رکھنا تو کجا استعمال کرنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر پھر اس نے سوچا، خالہ کے مشورے پر عمل کرنے میں حرج بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس نے وقار کو اپنے ذہن سے دھکیل کر نکال دیا۔

"میں ذرا سالن دیکھ آؤں۔ پھر تمہیں تمہارا کمرا دکھاؤں گی۔" ماجی خالہ نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

نیلما کھڑکی سے جھانکتی رہی۔ منظر اب بھی وہی تھا۔ ویسا ہی سکون تھا لیکن اب وہ خود پہلے جیسی مطمئن نہیں تھی۔ سکون کی جگہ اب اس کے وجود میں اضطراب اور خوف لہریں لے رہا تھا۔

ماجی خالہ کچن سے آئیں اور اسے اس کے کمرے کی طرف لے چلیں۔ "میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتی ہوں۔" راستے میں نیلما نے کہا۔ "آج کل تو آپ پینٹ کر رہی ہیں۔ ہے نا؟"

"ہاں۔ اور پینٹ کرتے ہوئے تخلیق کا احساس خوب ہوتا ہے۔ آج کل میں ایک زور دار کام کر رہی ہوں.......... اور بہت ایکسائیٹڈ ہوں اس سلسلے میں۔ تم پہلے اپنا کمرہ

دیکھ لو۔ چاہو تو کپڑے بدل لو۔ پھر اسٹوڈیو بھی دیکھ لینا۔"

وہ سیڑھیوں کے ذریعے نچلی منزل پر آئیں۔ کاٹیج کے سامنے والے حصے کے اعتبار سے وہ حصہ تہہ خانہ تھا لیکن عقبی کھڑکیاں بلندی پر تھیں۔ نیلما ابھی تک اس تضاد سے مطابقت پیدا نہیں کر سکی تھی۔

نیلما کے کمرے کے سامنے ایک خاصا بڑا پلیٹ فارم تھا، جو کمرے کے سلائیڈنگ ڈور سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ماجی خالہ نے دروازہ دھکیلا اور تازہ ہوا کمرے میں در آئی۔ پھر رل ترل کی آواز..........

"پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ بہتا ہے۔" خالہ نے بتایا۔ "چشمے کے اُس طرف کلثوم بیگم رہتی ہے۔ شوہر کی زندگی میں اس کا بہت بڑا فارم تھا۔ اب اس کے پاس صرف اتنے جانور ہیں، جو اس کے بس کے ہیں، جن کی وہ نگہداشت کر سکتی ہے۔ وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں کبھی کسی سے مدد نہیں لیتی۔"

خالہ بڑی شگفتگی سے باتیں کر رہی تھیں مگر نیلما کو احساس تھا کہ اس کے خوف اور پریشانیوں نے خالہ کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ اس نے بڑی نرمی اور محبت سے اپنا ہاتھ خالہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "خالہ.......... یہ جگہ میرے لئے محفوظ اور مناسب ہے نا؟ یہاں جرائم تو نہیں ہوتے؟"

"اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکی ہوں اور کس طرح یقین دلاؤں۔ نیلی گڑیا، یہ تمہارا شہر نہیں ہے۔ اب تم کپڑے بدل لو اور پھر اوپر آ جانا۔"

نیلما کو ایسا لگا جیسے ماجی خالہ اسے ٹال رہی ہوں۔ وہ اسے مزید بات کرنے کا موقع دیئے بغیر اوپر چلی گئی تھیں۔

اچانک اسے مکان کے عقبی حصے کی طرف سے ایک آواز سنائی دی۔ تاریکی خاصی گہری ہو گئی تھی۔ تاہم آسمان پر جگہ جگہ روشنی کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

باہر پلیٹ فارم پر ایک میز اور چند کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے چھ سات سال کا ایک لڑکا میز پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ شیشے میں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ وہی لڑکا تھا، جسے اس نے چٹانی چھجے پر پتنگ اڑاتے دیکھا تھا۔ اس عمر کے بچے اس سے بہت جلدی مانوس ہو جاتے تھے۔ اس کے دوست بن جاتے تھے۔ چنانچہ وہ کمرے سے پلیٹ فارم پر چلی آئی۔

"ننھے منے بچے.......... میں نیلما ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے بچے کو مخاطب کیا۔ بچہ بے مہری سے اسے گھورتا رہا۔ وہ ساکت کھڑی اس کے بولنے کا انتظار کرتی

رہی۔ بچّے کے گھنگریالے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

"یہاں سے چلی جاؤ۔" بچّے نے کہا۔

نیلما نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ "ٹھیک ہے۔ چلو پھر کبھی تعارف ہو جائے گا۔ ویسے تم بہت بڑی پتنگ اُڑا رہے تھے۔" اس نے شیریں لہجے میں کہا لیکن توقع کے برعکس یہ حوالہ بھی لڑکے کو نرم نہ کر سکا۔ وہ میز سے اُترا اور پلیٹ فارم کے اُفتادہ تر حصّے کی طرف بھاگا۔ وہاں سے اس نے چھلانگ لگائی اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

نیلما واپس آ گئی۔ اس نے سلائیڈنگ ڈور پر پردے کھینچ دیئے۔ وہ خود کو ڈپریشن سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے احساس تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات 'نہیں'۔ بعض بچے آسانی سے دوست نہیں بنتے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ رام ہوتے ہیں۔ یہ بچہ بھی بالآخر رام ہو جائے گا لیکن اس کے ذہن میں بچّے کے سخت الفاظ اور سخت لہجے کی بازگشت موجود تھی......... یہاں سے چلی جاؤ......... یہاں سے چلی جاؤ......... اس نے سوچا' ابھی اوپر جائے گی تو ماجی خالہ سے بچّے کے بارے میں پوچھے گی۔

☆======☆======☆

نہا دھو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ اب وہ خود کو تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ اوپر آئی۔ ماجی خالہ اسے ڈرائنگ روم میں موجود ملیں۔ "بس کھانا تیار ہونے ہی والا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "ایک مہمان بھی کھانے پر موجود ہو گا۔"

"کون؟" نیلما نے کشیدہ لہجے میں پوچھا۔

"شہناز' میری بہت اچھی سہیلی ہے لیکن عمر میں تم سے کچھ ہی بڑی۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہونگی۔ آؤ......... اب تمہیں اپنا سٹوڈیو دکھاؤں۔" یہ کہہ کر ماجی خالہ اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف چل دیں۔ نیلما اُن کے پیچھے پیچھے تھی۔

اسٹوڈیو ایک طویل و عریض کمرے میں تھا۔ شیشے کے اسکرین کے ذریعے اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ سامنے والے حصّے کو سٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جبکہ آخری حصّے میں خالہ کام کرتی ہوں گی۔

ماجی خالہ نے سوئچ آن کئے اور کمرا بقعۂ نور بن گیا۔ وہاں خصوصیت سے بہت

زیادہ روشنی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسٹوڈیو میں دن نکلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کئی ایزلز پر تصاویر لگی ہوئی تھیں جو نامکمل تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ان پر کام ہو رہا ہے۔ ایک ایزل پر سبز پردہ لہرا رہا تھا۔ ماجی خالہ اس کی طرف پیٹھ کر کے یوں کھڑی ہو گئیں' جیسے اسے چُھپانا چاہ رہی ہوں۔ "یہ تازہ ترین ہے اور ابھی نامکمل بھی ہے۔" انہوں نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "اس پر مجھے اعتماد بھی نہیں۔ اسی لئے میں اسے کسی کو نہیں دکھاتی۔"

نیلما دوسرے ایزلز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر اس نے دیوار پر آویزاں دوسری مکمل پینٹنگز کا جائزہ لیا۔ "یہ تو سب ایک جیسی معلوم ہو رہی ہیں۔" وہ اپنے لہجے کی حیرت نہ چُھپا سکی۔ "ایسا لگتا ہے کہ آپ سڑکوں' راہگزاروں اور پگڈنڈیوں کے سوا کسی چیز کو پینٹ نہیں کرتیں۔"

"جب سے میں اس علاقے میں آئی ہوں' یہ حقیقت ہے کہ مجھے راستوں کے سوا کچھ نہیں بھاتا۔" ماجی خالہ نے اعتراف کیا۔

پینٹنگز کے تمام مناظر پہاڑی علاقوں کے تھے۔ ہر منظر میں کوئی راستہ' کوئی پگڈنڈی یا کوئی سڑک ضرور موجود تھی۔ کسی تصویر میں انسانی وجود کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہر منظر میں مہیب تنہائی اور سناٹا تھا' جو چیختا چنگھاڑتا معلوم ہوتا تھا لیکن ان میں جو سکون کا تاثر ہونا چاہئے تھا' وہ مفقود تھا۔ تصاویر میں سادگی بھی تھی اور پُرکاری بھی۔ ہر تصویر کے موڈ میں عجیب سی سریت تھی۔ ماجی خالہ کو یہ ہُنر کیسے ملا' یہ نیلما نہ سمجھ سکی۔

"ایک بات بتائیں خالہ! یہ آپ کا تخیل ہے یا حقیقی زندگی کے منظر ہیں۔" اُس نے پوچھا۔

"دونوں کا امتزاج کہہ لو۔" خالہ نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔ شہناز کے آنے تک ہم باتیں کریں گے۔"

"یہاں کی فضا میں عجیب سی توانائی محسوس ہوتی ہے مجھے۔" نیلما نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

ماجی خالہ نے اثبات میں سر ہلایا اور خوش نظر آنے لگیں۔ "کبھی کبھی جب میں پینٹ کرتے ہوئے تھک جاتی ہوں اور اعصاب پر بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے تو میں یہاں آ بیٹھتی ہوں اور سب کچھ بھول جاتی ہوں۔"

نیلما بلیٹن بورڈ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہاں کچھ لوگوں کے فوٹو تھے۔ ایک فوٹو نے

نیلما کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ رنگین فوٹو تھا اور یقینی طور پر انلارج کرایا گیا تھا۔ فوٹو کسی حقیقی عورت کا تھا لیکن اس میں تخیلاتی تاثر موجود تھا۔ عورت کے نقوش بے حد نازک اور آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ حیران آنکھیں ایسا لگتا تھا کہ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کی تصویر کھینچ لی جائے گی۔ اس کے بڑے بڑے بال گلابی رِبن میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہوا کی شرارت سے ان کی ایک لٹ آزاد ہو کر رخسار کو چومنے چلی آئی تھی۔ وہ سفید قبا نما لباس میں تھی۔ اس کے پیر بمشکل گھاس سے ٹکے ہوئے تھے۔ بازو اوپر اٹھے تھے، جیسے وہ کسی الہامی دُھن پر رقص کر رہی ہو، جو صرف اسے سنائی دے رہی ہے۔ پس منظر میں جنگل کسی تاریک راز کی طرح استادہ تھا۔ درخت جیسے ساکت کھڑے سحر زدہ سے اُسے تک رہے تھے۔

نیلما کو اپنے وجود میں وہ تحرک سا محسوس ہوا جو علامت تھا کہ کوئی پوشیدہ راز کھلنے والا ہے۔ "یہ کون ہے؟" اس نے ماجی خالہ سے پوچھا۔

ماجی خالہ بورڈ کے پاس آئیں انہوں نے وہ پنیں ہٹائیں، جو فوٹو گراف کو بورڈ سے منسلک کئے ہوئے تھیں۔ "یہ تصویر مجھے ہٹا لینا چاہئے۔" انہوں نے کہا۔ "اس کا نام بانو تھا اور یہ تھی بھی ایسی ہی، جیسی اس تصویر میں نظر آ رہی ہے۔ خیر، چھوڑو اسے۔ ہمیں اور بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ آؤ.......... بیٹھو۔"

ماجی خالہ نے عورت کا تذکرہ کرتے وقت ماضی کا صیغہ استعمال کیا تھا لیکن بے حد سرسری انداز میں جو نیلما کو غیر فطری سا لگا۔ بہرحال وہ خالہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے اس کی نظر میز پر رکھی کتاب پر پڑی۔ وہ ستارہ جاوید کی "سرخ سڑک" تھی جس کے اسکیچ ماجی خالہ نے بنائے تھے۔ اس نے کتاب اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔

"کیسی حسین کتاب ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے کئی بچوں کو یہ کتاب دی۔ انہیں کہانیاں بھی اچھی لگیں اور آپ کے اسکیچ بھی۔"

"ستارہ کی موت ایک المیہ ہے۔ اس کی موت کو آٹھ ماہ ہو گئے مگر میں آج بھی اس کی کمی محسوس کرتی ہوں۔"

"آپ نے لکھا تھا کہ ان کی موت حادثاتی تھی۔ مجھے بھی بہت دُکھ ہوا تھا۔ وہ یہیں کہیں رہتی تھیں نا؟ ویسے آپ کسی اور رائٹر کے اشتراک سے اپنا کام جاری رکھئے گا۔"

ماجی خالہ نے اُس کے ہاتھ سے کتاب لی اور اسے جھٹکے سے بند کر دیا۔ "اب میرا

کسی اور کے ساتھ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" انہوں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "ستارہ اپنی موت سے پہلے جانوروں کے متعلق کہانیوں پر کام کر رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مرنے سے پہلے کتاب مکمل کر چکی تھی لیکن اس نے مجھے دکھائی نہیں۔"

"تو آپ اس کے اسکیچ بنائیں گی؟"

"کتاب ہی غائب ہو گئی ہے۔ ستارہ کے شوہر جاوید نے تلاش کی لیکن نہیں ملی۔ عمران کو اِس کتاب سے عشق ہے۔" ماجی خالہ نے "سرخ سڑک" کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"عمران ان دنوں مسائل سے دوچار ہے۔ وہ اپنے باپ رضوان سے ذہنی طور پر بہت قریب ہے۔ ویسے وہ ستارہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ ستارہ کی موت نے اُسے بہت زیادہ اَپ سیٹ کر دیا ہے۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ ستارہ پھسل کر گرنے کی وجہ سے مری تھیں۔ تفصیل تو آپ نے بتائی نہیں۔"

"ستارہ کو ہائیکنگ کا بہت شوق تھا اور وہ اکثر تنہا ہی نکل جاتی تھی۔ دوسری طرف جاوید جسمانی تحرک سے بچتا تھا۔ ستارہ کو بغیر بتائے اس خطرناک مہم پر نہیں جانا چاہئے تھا۔ تین دن تک تو اس کا پتا ہی نہیں چلا درحقیقت.........." ماجی خالہ کہتے کہتے رُک گئیں۔ انہوں نے کئی بار سر کو منفی جنبش دی۔ "چھوڑو اس قصے کو۔ مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں ہوتی۔ کم از کم فی الوقت یہ ممکن نہیں۔ ابھی میں بھی صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھل سکی ہوں۔"

"وہ بھی یہیں۔ اسی علاقے میں رہتی تھیں نا؟"

"ہاں۔ وقار کے کیبن سے کچھ اوپر ہے جاوید کا کاٹیج۔ بے چارہ جاوید۔ اب وہاں تنہا رہتا ہے۔ اس کے لئے بھی یہ وقت بہت کٹھن ہے۔ وہ خود بھی رائٹر ہے۔ اس کا موضوع پیرا سائیکولوجی ہے لیکن مجھے اس کے بیشتر مضامین سے اختلاف ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ پوری طرح سے تحقیق کئے بغیر، سمجھے بغیر لکھتا ہے۔ اس کے برعکس ستارہ باشعور عورت تھی۔ اس کا ثبوت اس کی کہانیاں ہیں۔"

"انہوں نے "سرخ سڑک" کے علاوہ بھی کہانیاں لکھی تھیں؟"

"ہاں۔ بہت لکھی تھیں۔ اگر میں نے مستقبل میں کسی کتاب کے اسکیچ بنائے تو وہ ستارہ ہی کی کتاب ہو گی لیکن جاوید، ستارہ کی اور کوئی کتاب چھپوانا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" نیلما کو جاوید کے بارے میں ناپسندیدگی کا احساس ہونے لگا۔

"ستارہ کی کہانیاں تخیلاتی ہیں جبکہ جاوید کو حقیقت پسندی کا دعویٰ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت سے بعید کہانیاں بچوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں اس سے مدلل گفتگو بھی کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔" ماجی خالہ نے کہا اور پھر چونک کر اُٹھ بیٹھیں۔ "لو.......... وہ شہناز آ رہی ہے۔ چلو.......... اس کا خیر مقدم کریں۔"

نیلما نے سنا بھی نہیں۔ چند لمحے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر ماجی خالہ' شہناز کو لے کر کمرے میں آئیں۔ شہناز تیس بتیس سال کی پُرکشش عورت تھی لیکن وہ اپنی طرف سے بے پروا معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ ویسے بھی کچھ پریشان اور برہم دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا شہناز؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وقار سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں' تم اُسے کیسے برداشت کرتی ہو۔" شہناز کی آواز میں تلخی تھی۔ مگر اس لمحے اُس کے لہجے میں برہمی تھی۔

ماجی خالہ نے نیلما کی طرف دیکھا۔ مگر اس کا کوئی منفی ردِ عمل نہ پا کر مطمئن ہو گئیں۔ "شہناز کو غصہ آئے تو کسی کو اس کے سامنے آنا راس نہیں آتا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر وہ شہناز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "ہوا کیا آخر؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"کہہ رہا تھا کہ رضوان کو بانو کی تلاش سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔ وہ اب نہیں ملے گی۔ میں نے سمجھایا کہ اُسے کم از کم رضوان یا عمران سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شام نگر اور اس کے نواح کا چپہ چپہ چھان مارا گیا ہے اور بانو کا سراغ نہیں ملا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تلاش ہی ترک کر دی جائے۔"

ماجی خالہ نے پُرتشویش نگاہوں سے نیلما کو دیکھا اور پھر شہناز سے بولیں۔ "اب تو شاید دو مہینے ہو گئے بانو کو غائب ہوئے۔"

"ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔" شہناز نے تصحیح کی۔

نیلما غائب الذہنی کی سی کیفیت سے دو چار تھی۔ اس کی سمجھ میں صرف ایک ہی بات آئی تھی۔ "غائب ہوئی ہے۔" اس نے یہی کچھ زیرِ لب دُہرایا۔

"اب یہ باتیں چھوڑو۔" ماجی خالہ نے جلدی سے کہا۔ "چلو میز پر۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔"

کھانا لگانے میں نیلما نے خالہ کا ہاتھ بٹایا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں کھانے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ نیلما اپنی تشویش اور پریشانی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ ماجی خالہ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے شام نگر بلایا ہے۔ ماجی خالہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ بولیں۔ "تم کیوں پریشان ہوتی ہو نیلی۔ تم سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ تم تو اس سلسلے میں سوچو بھی نہیں۔"

"کتنی عجیب بات ہے کہ علاقے میں ایک ہی سال میں گمشدگی کے دو واقعات رونما ہوئے۔" شہناز نے کہا۔

"یہ تو درست نہیں ہے۔ ستارہ کی تو لاش مل گئی تھی.......... اور اس کی موت حادثہ تھی اور بانو کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس کے انداز و اطوار شروع ہی سے عجیب تھے۔" ماجدہ باقر نے اختلاف کیا۔

"بے چاری بانو! وہ تو ہر اعتبار سے اپنے شوہر پر انحصار کرتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس کے بچے کو اس کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔" شہناز نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "اور رضوان کو اس کی تلاش سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ ستارہ کی موت نے اسے ڈرا دیا ہے۔ جب تک کوئی حتمی بات سامنے نہ آئے وہ بانو کی تلاش سے دست بردار نہیں ہو گا۔ وہ تو اپنا کام بھی بھول بیٹھا ہے۔ اب تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ کم از کم بانو کی لاش ہی مل جائے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔" نیلما نے فریاد کی۔

"مجھے یہ سب کچھ تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا.........."

"تو اب بتا دیں۔" نیلما نے خالہ کی بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ بتا کیوں نہیں دیتیں۔" شہناز نے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں۔" ماجی خالہ نے کہا۔ نیلما ان کی ہچکچاہٹ کا سبب جانتی تھی لیکن شہناز کو علم نہیں تھا۔ شہناز کو سفید لبادے والی رقاصہ فطرت کا فوٹو یاد آ گیا۔ "تمہیں وقار کی بات پر کیوں غصہ آیا تھا؟" ماجی نے شہناز سے پوچھا۔

"وقار مجھے کبھی اچھا نہیں لگا لیکن آج اس کی بات سن کر مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ جانتا ہے۔ میں نے یہ بات اس سے پوچھ بھی لی۔ اس نے منہ بنایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھ پر ہاتھ اٹھا بیٹھے گا۔ اس کے غصے کو تو تم جانتی ہی ہو۔ میں تمہیں پھر سمجھا رہی ہوں' اس پر

بھروسا مت کرو۔ وہ ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔"

"مجھے وقار کی کوئی پروا نہیں۔"

نیلما کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں پہاڑ کی طرف اٹھ گئیں۔ شہناز نے بھی اس طرف دیکھا اور بولی۔ "وقار یہیں رہتا ہے۔ اس نے جنگل کے بہت قریب اپنا کیبن بنایا ہے۔ اس سے کچھ اوپر جاوید کا کاٹیج ہے۔" پھر وہ ماجدہ کی طرف مڑی۔ "نیلما کو بانو کے بارے میں بتاؤ نا۔ چھپانے کا کیا فائدہ۔ جلد یا بدیر اس کی ملاقات رضوان سے ہونی ہی ہے۔" اس نے کہا۔

ماجی خالہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ "جو کچھ ہوا، اچانک ہی ہوا۔ ایک صبح رضوان اور عمران سو کر اٹھے تو بانو غائب تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ٹہلنے کی غرض سے نکلی تھی.........."

"اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بانو لا اُبالی عورت تھی۔ اسے چاندنی رات میں چہل قدمی کا خبط تھا۔ پورے چاند کی رات آتی تو وہ مضطرب دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی وہ طلوعِ آفتاب سے پہلے بھی ٹہلنے نکلتی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اب تک کسی سانپ نے اسے ڈسا کیوں نہیں۔"

"یہ بانو کا مزاج.......... اس کا مخصوص انداز تھا۔" ماجی خالہ نے درگزر کرنے والے لہجے میں کہا۔ "جیسے مجھے سڑکیں، راستے اور پگڈنڈیاں پینٹ کرنے کا خبط ہے۔ بانو کہتی تھی کہ جنگل میں وہ محفوظ ہے۔ سانپ اس کے دوست ہیں۔ وہ تھی بھی کچھ عجیب ہی۔ مجھے تو اس کی بلی بھی عجیب ہی لگتی ہے۔"

"اور کتنی عجیب بات کہ بانو کے ساتھ اس کی بلی بھی غائب ہے۔"

"میں یہ ناخوش باتیں تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی۔" ماجی خالہ نے نیلما سے کہا۔ "کم از کم آج تو تمہیں چین سے سونے دیتی۔"

نیلما کو اپنے تحرک کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے وجود میں کوئی تاریکی متحرک ہو گئی ہو۔

ماجی خالہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں.......... اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔ "نہیں نیلی، اس قوت کو ابھی خود پر حاوی نہ آنے دو۔" انہوں نے کہا۔ "تم اسے روک سکتی ہو۔ اس پر تمہارا اختیار ہے۔"

"کیا مطلب؟" شہناز نے چونک کر پوچھا۔

نیلما نے نظریں اٹھا کر بے بسی سے ماجی خالہ کو دیکھا اور بولی۔ "چاہیں تو بتا دیجئے انہیں۔"

ہچکچانے کے باوجود کھانے کے دوران خالہ نے شہناز کو اس قدرتی صلاحیت کی مکمل کہانی سنا دی۔ اس دوران شہناز بار بار نیلما کو دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں سے اس کے اندرونی ہیجان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

"تب تو میرا خیال ہے، تمہیں قدرت نے یہاں بھیجا ہے۔" ماجی خالہ کے چپ ہونے کے بعد شہناز نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم یقینی طور پر رضوان کی مدد کر سکتی ہو۔"

ماجی خالہ نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نیلما کا اضطراب بڑھ گیا۔

"مجھ میں حادثات کا شکار ہونے والوں کو تلاش کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"ضروری تو نہیں کہ بانو کو کوئی حادثہ ہی پیش آیا ہو۔" شہناز نے جلدی سے کہا۔ "کیا پتا، اس کی گمشدگی کا کوئی خوف ناک سبب ہو۔"

"بس بھئی، اب ختم کرو یہ سب۔" ماجی خالہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں برتن سمیٹ لوں، پھر کھیر لاتی ہوں۔"

"چلو.......... فی الحال یہ بتاؤ، یہ سب کیسے ہوتا ہے؟" شہناز نے اپنے اصرار سے دستبردار ہوتے ہوئے نیلما سے کہا۔ "تمہیں سراغ کیسے ملتا ہے؟"

نیلما خاموشی سے برتن سمیٹتی رہی۔

"بات صرف تجسس کی نہیں۔ مجھے عمران اور رضوان سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر تم اُن کی مدد کر سکیں تو.........."

"میں بانو کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کرتی اور محسوس کرنا بھی نہیں چاہتی۔" نیلما نے تیز لہجے میں شہناز کی بات کاٹ دی۔ "اور اگر ایسا ہوا تو وہ بھی نقصان دہ ہو گا۔ میری صلاحیت سے آج تک کسی کو فائدہ نہیں پہنچا۔"

"تم کچھ مت سوچو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آرام کرو۔" ماجی خالہ نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"وقار یہ کیوں کہتا ہے کہ بانو کی تلاش ترک کر دینی چاہئے؟" نیلما نے شہناز سے پوچھا۔

"کون جانے۔" شہناز نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ خود کو کوئی پہنچا ہوا نجومی سمجھتا ہے۔ مجھے تو اس کے انداز پاگل کر دیتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص کے اندر کا حال جانتا ہے۔"

ماجی خالہ کھیر لے آئی تھیں۔ وہ تینوں خاموشی سے کھیر کھاتی رہیں۔ کچھ دیر بعد باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

"یہ تو جاوید معلوم ہوتا ہے۔" شہناز نے کہا۔

ہاں۔ لگتا تو وہی ہے۔" ماجی خالہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر انہوں نے نیلما کو بتایا۔

"ستارہ کا شوہر۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ساتھ ایک دُبلا پتلا دراز قد شخص تھا' جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا بیگ تھا۔ زپ لگی نہ ہونے کی وجہ سے اس میں سے کتابیں جھانک رہی تھیں۔ اس نے بیگ فرش پر رکھ دیا۔

ماجی خالہ نے اس سے نیلما کا تعارف کرایا۔ پھر بولیں۔ "بیٹھو جاوید۔ مجھے معلوم ہے' تمہیں کھیر پسند نہیں۔ ابھی تمہیں کافی پلاؤں گی۔"

جاوید' نیلما کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ "تو تم شبنم نفیس کی بیٹی ہو............"
چند لمحے بعد اس نے کہا۔ "باجی تمہارے متعلق اکثر باتیں کرتی ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تمہیں اپنی ممی کے نقشِ قدم پر چلنا پسند نہیں ہے۔"

وہ بے حد وجیہہ آدمی تھا۔ فلمی اداکاروں کی طرح خوبرو اور باوقار۔ مگر اس میں کچھ نسوانی نزاکت بھی تھی۔ "میں آپ کی فرمائش کے مطابق "سُرخ سڑک" کی جتنی جلدیں بھی مل سکیں' لے آیا ہوں۔ آج میں نے ستارہ کے سامان کو ٹٹولا اور قرینے سے رکھا ہے۔" اس کا انداز بے حد حقیقت پسندانہ تھا لیکن نیلما کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے جذبات کو اس انداز کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ماجی خالہ نے اس سے کتابیں لیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

"تم چاہو تو ستارہ کی چیزیں الگ کرنے کے کام میں مَیں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" شہناز نے جاوید کو پیش کش کی۔

جاوید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شکریہ............ یہ کام میں خود ہی کرنا چاہتا ہوں۔ بس مکان فروخت ہو جائے' پھر میں شام نگر چھوڑ کر شہر چلا جاؤں گا۔"

"شہر کیوں جا رہے ہو؟" ماجی خالہ نے کہا۔ "میرے خیال میں تو رائٹرز کے لئے

شام نگر آئیڈیل جگہ ہے۔"

"آپ یہاں کے پُرسکون ماحول کی وجہ سے یہ بات کہہ رہی ہیں۔" جاوید نے طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر نیلما سے مخاطب ہوا۔ "اب یہ جگہ اتنی پُرسکون نہیں رہی۔ یہاں بھی عجیب عجیب واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔ میں صرف ستارہ کی خوشی کی وجہ سے یہاں مقیم تھا۔ وہ بہت تنہائی پسند تھی۔ اب مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ جب بانو ملے تو میں یہاں موجود ہوں اور وہ منظر دیکھوں۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ بانو مل جائے گی؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

"یہ تو ناگزیر ہے۔ وہ جس لباس میں تھی' اس میں یہ علاقہ تو نہیں چھوڑ سکتی۔ ساتھ وہ کچھ لے کر نہیں گئی۔" جاوید نے دلیل دی۔

نیلما نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کے لہجے میں اسے کوئی خاص بات محسوس ہوئی تھی لیکن اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

ماجی خالہ اور نیلما جاوید کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "ابھی پانچ منٹ بعد ٹی وی پر شبنم کا پروگرام آنے والا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تم لوگ دیکھنا چاہو تو ٹی وی آن کر دوں؟"

"ضرور............ ضرور۔" شہناز نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ "میں ان سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔"

جاوید بے دلی سے ان کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا آیا' جہاں ٹی وی رکھا تھا۔

ماجی خالہ نے ٹی وی آن کر دیا۔ چند منٹ بعد پروگرام شروع ہوا۔ شبنم نفیس ہمیشہ جیسی باوقار اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑے سکون اور اعتماد سے پروگرام کے میزبان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ پھر اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نیلما کے لئے وہ مرحلہ جانا پہچانا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب آگے کیا ہو گا۔ مما پر بہت تیزی سے کیفیت طاری ہوتی تھی۔

شبنم نفیس اب جھوم رہی تھی۔ پھر اچانک جیسے سب کچھ ٹھہر گیا۔ وہ ساکت ہوئی اور اس کے لب ہلے۔ مگر وہ آواز اس کی نہیں لگتی تھی۔ میزبان نے جو سوال کئے' ان میں گہرائی نہیں تھی۔ شبنم نے بہت آسانی سے ان کے جوابات دیئے۔ مگر پھر ایک مہمان نے سوال کیا۔ "اے مہربان روح' تمہارے توسط سے محترمہ شبنم صاحبہ جو دولت حاصل کرتی ہیں' اُس کا وہ کیا کرتی ہیں؟" انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہے نہ غرض۔" روح نے جو شبنم نفیس کا قالب استعمال کر رہی تھی، بھاری آواز اور سرد لہجے میں کہا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں کہ شبنم میری مدد سے ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہے۔"

نیلما مسکرا دی۔ اُسے مہمان سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ مہمان نے دوسرا سوال کیا لیکن روح نے یا شبنم نے اسے نظرانداز کر کے کہا۔ "اس وقت میں ایک ایسی شخصیت سے مخاطب ہوں، جو ایک بڑی پریشانی سے دوچار ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ میں اسے تنبیہہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ خودکشی ناقابلِ معافی گناہ ہے اور یہ کہ اُس کی بیوی کی موت حادثہ نہیں تھی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی شبنم نے آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ پھر شبنم نفیس تھی۔

مہمان بشیر صدیقی کو غصہ آ گیا۔ "یہ کیا تماشا ہے کیسا ڈراما ہے۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "یہ تکا تو کہیں بھی لگ سکتا ہے۔ اس شہر میں ایسے ہزاروں افراد ہوں گے جن کی بیویاں مر چکی ہوں گی اور ان میں سے کچھ خودکشی کا ارادہ بھی کر رہے ہوں گے لیکن یہ حرکت ایسے تمام لوگوں کو خودکشی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر سکتی ہے۔"

نیلما نے جاوید کو دیکھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور انگلیوں کی پوریں سپید پڑ گئی تھیں۔ وہ بھی مہمان کی طرح برہم نظر آ رہا تھا۔

"ممکن ہے، محترمہ شبنم صاحبہ کا اشارہ تمہاری طرف ہو جاوید۔" شہناز نے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ "مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ ستارہ پھسل نہیں سکتی۔ ہائیکنگ کے دوران وہ بے حد محتاط رہتی تھی۔"

جاوید بے حد پریشان نظر آنے لگا۔ نیلما کو محسوس ہو گیا کہ مما کے الفاظ اور پھر شہناز کے جملے نے اسے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "اب کون آ گیا؟" ماجی خالہ نے اٹھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

جاوید، شہناز کو گھور رہا تھا، جیسے اس کی سماعت میں اب بھی شہناز کی الفاظ گونج رہے ہوں۔ پھر اس نے تاخیر کے باوجود تردید ضروری سمجھی۔ "تمہارا نظریہ احمقانہ ہے۔" اس نے شہناز سے کہا۔ "ستارہ کا کوئی دشمن نہیں تھا جو اسے نقصان پہنچاتا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" شہناز نے خلافِ توقع اس کی تائید کی۔ "بھول جاؤ کہ میں نے کچھ کہا تھا۔"

لیکن شبنم نفیس کی کہی کوئی بات کون بھول سکتا تھا۔ اب کسی کی توجہ ٹی وی کی

طرف نہیں تھی۔

ماجی خالہ واپس آئیں تو ان کی ساتھ ایک شخص بھی تھا، جو نیلما کے لئے اجنبی تھا۔ بہرحال شہناز اور جاوید اس سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کی خیریت دریافت کی۔

"یہ ہیں عمران کے والد.......... رضوان۔" ماجی خالہ نے نیلما کو بتایا۔

رضوان دراز قامت تو نہیں تھا لیکن جاوید کے مقابلے میں جان دار زیادہ تھا۔ اپنے بیٹے کے برعکس وہ ہنس مکھ تھا اور ہر وقت مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ "مجھے اپنے مخل ہونے پر افسوس ہے۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں ماجی خالہ سے کہا۔ "لیکن مجھے بہت ضروری بات بتانا تھی آپ کو۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ٹی وی آف کر دیتی ہوں۔" ماجی خالہ نے کہا۔

نیلما کو احساس ہو رہا تھا کہ کوئی ایسا انکشاف ہونے والا ہے جسے جاننا اس کے لئے سود مند نہیں ہو گا۔ کوئی باطنی قوت اسے مداخلت پر مجبور کر رہی تھی۔ "نہیں.......... ابھی کمرشلز کا وقفہ ہے۔ میں مما کا پروگرام دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ماجی خالہ کے اصرار پر رضوان ہچکچاہٹ کے باوجود بیٹھ گیا۔ نیلما ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کن انکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ رضوان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور بولا۔ "آج عمران کو بانو کا یہ دوپٹہ ملا ہے۔" اس نے دوپٹہ دکھایا جو اس نے جیب سے نکالا تھا۔ "یہ اسے چشمے کے قریب پڑا ملا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ جا کر دیکھا لیکن ہمیں اور کوئی چیز نہیں ملی۔ چشمہ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ امکان نہیں کہ بانو ڈوبی ہو گی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

نیلما اُسے بغور دیکھتی رہی تھی۔ اس کے لہجے میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ چہرے پہ تاثر۔ صرف اس کی گہری آنکھیں زندہ اور بولتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نیلما کو نہ جانے کیوں اُن آنکھوں سے خوف محسوس ہوا۔

"نیلی!" ماجی خالہ نے ہچکچاتے ہوئے اسے پکارا۔ "پلیز گڑیا.......... ذرا اس دوپٹے کو چھو کر تو دیکھو۔" ان کا لہجہ التجائیہ تھا۔

نیلما بری طرح بھڑکی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ "نہیں ماجی خالہ نہیں۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔" اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ ماجی خالہ صلاحیت سے استفادے پر کیوں زور دے رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ یہ آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ماجدہ باجی کیا چکر ہے یہ؟"

رضوان کے لہجے میں الجھن تھی۔

نیلما دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکرین پر مما کا چہرہ تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بھاری مردانہ آواز میں میزبان کے آخری سوال کا جواب دے رہی تھیں۔ نیلما نے گہری سانس لی اور دل ہی دل میں اپنی ماں کو مدد کے لئے پکارا۔ ماضی میں کئی بار اس کے اور مما کے درمیان ٹیلی پیتھی کا رابطہ قائم ہوا تھا لیکن بعد کے عرصے میں ماں بیٹی کے درمیان حائل ہونے والا فاصلہ شاید سب کچھ مٹ چکا تھا۔ اسی لئے نیلما کو اب کوئی امید نہیں تھی..........

مگر اس لمحے اچانک مما نے آنکھیں کھولیں۔ اب وہ براہ راست کیمرے کو.......... یا کیمرے کے توسط سے اپنی بہن کے ڈرائنگ روم اور اس میں موجود افراد کو دیکھ رہی تھیں۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ ٹی وی بھی آواز سے محروم تھا۔ پھر شبنم نفیس کی اپنی آواز ابھری۔ نرم شیریں آواز۔ شاید روح جا چکی تھی۔ "نیلما.......... تم خطرے میں ہو۔" اس نے کہا۔ "میں کہتی ہوں، جلد از جلد یہاں سے نکل لو۔ زیادہ سے زیادہ کل تک۔ میں تمہارے گرد گھٹائیں دیکھ رہی ہوں۔ تم خطرناک قسم کی ڈھند میں گھری ہوئی ہو۔"

اسکرین پر پروگرام کا میزبان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "یہ.......... یہ نیلما کون ہے؟" اس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

شبنم نفیس نے سر جھکا اور آنکھیں موند لیں۔ پروگرام یوں جاری ہو گیا، جیسے سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں تھا۔ نیلما نے خوف زدہ نظروں سے ایک بار ٹی وی اسکرین کو دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ رضوان اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں سوالات بھی تھے اور تجسس بھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ تو اسی لمحے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی، وہ اُن میں سے کسی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلی اور اس کمرے کی طرف لپکی، جو ماجی خالہ نے اس کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کان ہاتھوں سے ڈھانپ لئے۔ وہ خود کو کسی قلعے کی طرح بند کر لینا چاہتی تھی۔ مما اس تک پہنچی تھیں تو اس کی التجا کے نتیجے میں۔ اور مما کی نصیحت ایک طرف، اس دوپٹے کو تو

وہ ویسے بھی کسی قیمت پر ہاتھ نہ لگاتی۔ دوسری طرف رضوان کی نگاہوں کی خاموش التجا بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ اسے ناقابلِ اعتبار سمجھنے اور اس سے خوف زدہ ہونے پر مجبور تھی۔

☆======☆======☆

وہ گہری نیند میں نہیں تھی، اسی لئے اس نے ماجی خالہ کی دستک سن لی۔ پھر دروازہ کھلا اور خالہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "سو گئیں؟"

"آ جائیے۔ میں جاگ رہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

ماجی خالہ کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ اس پر دودھ سے بھرا ایک گلاس رکھا تھا۔ انہوں نے بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ "جو کچھ ہوا، مجھے اس پر افسوس ہے۔ سب کچھ اچانک ہی ہوا اور میں کسی بھی طرح تمہیں علیحدہ نہ رکھ سکی۔ اب میں کسی کو مدعو ہی نہیں کروں گی، بس ہم تم ہوں گے۔"

"کل میں یہاں ہوں گی ہی نہیں۔" نیلما نے کہا۔ "آپ نے سنا، مما نے کیا کہا۔ اس بار میں ان کی بات ضرور مانوں گی۔ میں کل صبح ہی واپس چلی جاؤں گی۔"

"اگر تم یہ محسوس کرتی ہو کہ تمہارا یہ اقدام درست ہے تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے سوچا تھا، تمہیں خاصے طویل عرصے تک روک کے رکھوں گی۔ مجھے خود تمہاری مدد کی ضرورت تھی۔ اِن دنوں میرا کام بھی متاثر ہو رہا ہے۔ تمہاری صلاحیت.........."

"میں اپنی مدد تو کر نہیں سکتی، کسی اور کی کیا مدد کروں گی۔"

ماجی خالہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ "کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ میں پینٹ کرنا چاہ رہی تھی، اس سے زیادہ پینٹ کر رہی ہوں۔ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جیسے میں خود کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" ان کے لہجے میں الجھن تھی۔ وہ پریشان نظر آنے لگیں۔ نیلما سب کچھ بھول کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اچھا.......... یہ بتائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں.......... اور کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"میری بنائی ہوئی چند پینٹنگز دیکھ کر شاید تمہیں کچھ اندازہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی کہ مجھے کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے ایک پینٹنگ جنگل کے پس منظر میں بانو کی بنائی ہے۔ جب میں اس کو دیکھتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا

ہے کہ وہ مجھے کچھ بتانے.......... کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے حالانکہ یہ بھی طے ہے کہ وہ میری تخلیق ہے۔ میرے شعور نے اسے جنم اور میری انگلیوں نے برش کے توسط سے اسے روپ دیا ہے۔"

"صبح میری روانگی سے پہلے مجھے وہ پینٹنگ دکھایئے گا۔" نیلما نے دودھ کا گلاس خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے تھے اور آنکھوں میں نیند اُتری چلی آ رہی تھی۔ اس نے تکیئے پر سر ٹکا دیا۔

"اگر اندر کچھ ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح سطحِ شعور تک بہرحال آئے گا۔" ماجی خالہ بولیں۔ "ستارہ اور شہناز کے پس منظر میں ایک دلچسپ بات ہے، جو میں نے تمہیں نہیں بتائی ہے۔ بہرحال اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم تو کل جا ہی رہی ہو۔"

دھیرے دھیرے نیلما کی نیند اُڑنے لگی۔ "اب بتا بھی دیجئے۔ مجھے معلوم ہے، آپ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہی ہو گی۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

ماجی خالہ ہنس دیں۔ "تم مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ خیر، سُن لو۔ اچھا خاصہ افسانہ ہے۔ ستارہ اور شہناز بچپن کی سہیلیاں ہیں۔ کالج پہنچ کر دونوں کچھ دور ہو گئیں۔ دونوں کے مضامین الگ الگ تھے۔ جاوید اس کالج میں پڑھاتا تھا۔ شہناز اس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ دونوں کے درمیان قلبی تعلق استوار ہوا۔ شادی کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر شہناز سے غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے ستارہ کو جاوید سے متعارف کرا دیا۔ ستارہ بہت حسین تھی۔ بات کچھ کی کچھ ہو گئی۔ شہناز اور جاوید کا دلی تعلق تو نہ ٹوٹ سکا لیکن ستارہ نے جن نظروں سے جاوید کو دیکھا' جاوید مزاحمت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مردوں کی اسی کمزوری سے تو مجھے نفرت ہے۔ بہرحال جاوید ستارہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور شہناز بے چاری دیکھتی رہ گئی۔"

"شہناز کا کیا ردِ عمل رہا؟" نیلما نے پوچھا۔

"یہی تو عجیب بات ہے۔ ستارہ کی شادی کے بعد بھی شہناز سے اس کی دوستی قائم رہی۔ شہناز نے کبھی ستارہ کو الزام بھی نہیں دیا۔"

"یہ تو شہناز کی بڑائی ہے ویسے ستارہ کی موت نے جاوید پر کیا اثر چھوڑا ہے؟"

"وہ مکان میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ ہفتوں اس نے کسی کو اپنی صورت بھی نہیں دکھائی۔ اب وہ یہاں سے جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ شاید اب وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ بانو ملے گی ضرور.......... لیکن زندہ نہیں.......... ستارہ کی طرح' اور آج تو تمہاری مما نے بھی اشارہ کر دیا ہے کہ ستارہ کی موت حادثاتی نہیں۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" نیلما نے پوچھا۔ "ظاہر ہے' آپ نے یہ سب کچھ مجھے یونہی تو نہیں بتایا ہے۔"

"میں نے سوچا ہے کہ میں تمہیں بنیاد فراہم کر دوں۔ ممکن ہے' تمہیں خواب میں کوئی اشارہ مل جائے۔ میں چاہتی ہوں' تم یہاں اتنا عرصہ ضرور ٹھہرو کہ رضوان کو سمجھ سکو۔ یہ بات نہیں کہ وہ کوئی پسندیدہ شخصیت ہے۔ اسے اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے لیکن اندر سے وہ کچھ مختلف ہے اور اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ اعتراف کرے نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اتنا کہہ کر ماجی خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "شب بخیر نیلی۔"

وہ چلی گئیں۔ نیلما دیر تک جاگتی رہی۔ باہر جھینگروں نے اپنا مخصوص راگ الاپنا شروع کر دیا۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی اور خواب شروع ہو گیا۔ وہ وہی خواب تھا' جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ اونچی دیواروں اور سرخ فرش والی راہداری میں تھی۔ اسے احساس تھا کہ نکلنے کا راستہ صرف آگے کی سمت ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عقب سے تعاقب کرنے والے قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ اُسے یہ احساس بھی تھا کہ راہداری کے اگلے موڑ پر اس کے لئے خطرہ موجود ہے۔ کوئی قوت ہے جو اس کی موت کی خواہاں ہے لیکن وہ اس موڑ تک کبھی نہیں پہنچ پائی تھی۔ اس سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس بار بھی یہی کچھ ہوا۔

☆======☆======☆

اگلی صبح نیلما اٹھی۔ نہانے کے دوران اس پر روانگی کی دُھن سوار رہی۔ کپڑے بدلنے کے بعد اوپر گئی اور ماجی خالہ کو سلام کیا۔ ناشتا تیار تھا۔ وہ دونوں ناشتا کرنے بیٹھ گئیں۔ "نیند تو تم نے ٹھیک ٹھاک لے لی ہے۔" ماجی خالہ نے کہا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے وضاحت کی۔ "صورت سے ہی انداز ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ فریش لگ رہی ہو۔"

"جی ہاں۔ اچھی نیند آئی۔" نیلما نے خواب کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا۔

ناشتے کے بعد نیلما نے برتن دھوئے اور خالہ کے پاس آ بیٹھی۔ "یہ شہناز کہاں رہتی ہے؟" اس نے خالہ سے پوچھا۔

"رضوان کے پرانے مکان میں رہتی ہے' جو نرسری کے نزدیک ہی ہے۔ جاوید کو کھونے کے بعد اس نے ایک فوجی سے شادی کی تھی۔ اس کی شہادت کے بعد سے وہ

اکیلی ہے۔"

"جاوید میں ان کی دلچسپی اب بھی باقی ہے؟"

ماجی خالہ جواب دینے سے پہلے چند لمحے ہچکچائیں۔ "شاید ایسا ہی ہے۔ مگر تم شہناز کے بارے میں سوچ کر مت الجھو۔ وہ منہ پھٹ ضرور ہے مگر دل کی بری نہیں اور بانو کی گمشدگی سے وہ سچ مچ پریشان ہے۔"

نیلما نہ کسی کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی' نہ الجھنا چاہتی تھی۔ وہ تو جلد از جلد وہاں سے رخصت ہونے کے چکر میں تھی۔ اگرچہ وہ علاقہ بے حد حسین اور دل فریب تھا۔ مگر اب اسے وہاں رہنے کا سوچ کر ہی وحشت ہو رہی تھی۔

"مجھے امید ہے کہ تم نے واپسی کا ارادہ بدل دیا ہو گا۔" ماجی خالہ نے کہا۔ "ہمیں تمہاری ضرورت ہے نیلی گڑیا۔"

"میں اس انداز میں کسی کی بھی ضرورت نہیں بننا چاہتی۔ پلیز خالہ .... آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کے پاس رہنے کے لئے آئی تھی مگر یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے' اس کے پیش نظر میں یہاں رکنے کی جرات نہیں کر سکتی۔"

"تم اب جاؤ گی کہاں؟ شہر سے تو تم خوف زدہ ہو کر نکلی ہو۔" ماجی خالہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

نیلما بری طرح گڑبڑا گئی۔ واقعی......... اس سلسلے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف یہاں سے فرار کی ٹھانی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بانو کی لاش ملنے میں اس کی مدد شامل ہو لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ کہاں جائے گی؟

"میں کسی اور شہر چلی جاؤں گی اور گمنام حیثیت سے کچھ عرصہ گزاروں گی۔ اس وقت تک' جب تک مجھے اس صلاحیت سے نجات نہیں ملتی۔"

"بات سنو گڑیا۔" ماجی خالہ نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "زندگی میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کو دانستہ پُرخطر راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور اسے اس کے لئے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محتاط لوگ کم ہی اپنی منزل تک پہنچ پاتے ہیں۔ وہ قدرت کی بہت ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ جاتے ہیں۔ وہ تو بس بچتے رہتے ہیں۔ اس وقت تم بھی یہی کر رہی ہو مشیت نے ہر انسان کے لئے ایک راستے' ایک منزل کا تعین کیا ہے۔ تمہاری منزل کی طرف تو غیر واضح اور مبہم اشارہ بھی کیا جا رہا ہے۔ تمہیں اپنے راستے پر بڑھنا ہے۔ دیکھونا۔ یہاں آنے سے پہلے نہ تمہیں علم تھا' نہ مجھے کہ تمہیں کیا کرنا

ہے۔"

"آپ کو تو اب بھی علم نہیں۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ ممانے مجھے ہدایت دی ہے اور مجھے اس پر عمل کرنا ہے۔"

"شبنم کا انداز تو ہمیشہ سے ڈرامائی رہا ہے۔ آدمی کو اپنی تعلیم خود حاصل کرنا ہوتی ہے' اپنا سبق خود یاد کرنا ہوتا ہے۔ فرار سے کام نہیں چلتا۔"

نیلما اٹھ کر خالہ سے لپٹ گئی۔ "آپ بتائیں' میرے لئے کیا بہتر ہے؟"

"تمہیں اپنے راستے کا خود انتخاب کرنا ہے۔ جو کچھ سیکھنا ہے' خود سیکھنا ہے۔ مگر رخصت ہونے سے پہلے میں تمہیں وہ چیز دکھانا چاہتی ہوں جو وقار کو ملی تھی۔" یہ کہہ کر وہ الماری کی طرف گئیں اور اس میں سے پیک کیا ہوا ایک پارسل نکال لائیں۔ "گھبراؤ مت۔ یہ بانو کا دوپٹہ نہیں ہے۔" انہوں نے پارسل نیلما کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

نیلما نے ہچکچاتے ہوئے پارسل لیا' ربن کی بندش کھولی اور کاغذ ہٹایا۔ اندر ایک سلیپر تھا۔ بے حد پرانا اور بوسیدہ۔ وہ سیاہ مخملی' نسوانی سلیپر تھا' جس پر گلابی اور سبز رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ اب نیلما کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سلیپر کو چھوتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ جیسے سلیپر کے اندر کوئی قوت موجود ہو۔ مگر یہ بھی طے تھا کہ وہ قوت زندگی کی نہیں' موت کی ہے۔ وہ سرد سی رو تھی' جو اس کی انگلیوں کے راستے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

"یہ سلیپر جس نے بھی پہنا تھا' وہ مر چکا ہے۔" اس نے کہا۔ اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی سی لگی۔ سلیپر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کمزوری کا شدید احساس ہونے لگا۔ وہ بے جان سے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

"یہ سلیپر بانو کا تو نہیں ہے نا؟" ماجی خالہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے' یہ سلیپر بانو کا نہیں ہے۔"

"جس کا یہ سلیپر ہے' اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"

"سلیپر سے پتا تو چل سکتا ہے لیکن میں کچھ جاننا نہیں چاہتی۔"

"جس کا یہ سلیپر ہے' کیا اس کی موت متشددانہ تھی؟"

"قتل ہمیشہ تشدد کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔" سرد لہر نے نیلما کو بتا دیا تھا کہ موت صرف موت نہیں' کوئی وحشیانہ قوت ہے' جو زندگی پر حملہ آور ہوئی تھی۔

"تب تو تمہارا رکنا ضروری ہے۔" ماجی خالہ نے کہا۔ "اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔

تم کوشش کرو تو قاتل بے نقاب ہو سکتا ہے۔"

نیلما کا جسم لرزنے لگا۔ "میں نے کبھی کسی قاتل کو بے نقاب نہیں کرنا چاہا۔ میں چاہتی بھی نہیں۔ مما بھی اسی بات سے خوف زدہ ہیں کہ اس طرح میں خود کو کسی خطرے سے دوچار کرلوں گی لیکن خالہ.......... مجھ میں اتنا حوصلہ ہے ہی نہیں۔"

"میرا خیال ہے، تم چلی ہی جاؤ۔" ماجی خالہ نے بے بسی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن نیلما، تم اس بات کو کبھی نہیں بھلا سکو گی، کبھی ذہن سے نہیں جھٹک سکو گی۔ احساس جرم تمہیں ستاتا رہے گا۔ حالات سے فرار ضمیر کے لئے جرم ہی بن جاتا ہے۔"

"یہ کوئی جرم نہیں۔ میں تو صرف اپنا سکون برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ بے سکونی اور انتشار سے بچ رہی ہوں۔ صرف یہی نہیں، میں اپنی زندگی کو موت کے ممکنہ خطرے سے بچا رہی ہوں۔"

اچانک مکان کے کسی حصّے سے ایسی آواز ابھری، جیسے کہیں کوئی چیز گری ہو۔ نیلما اور ماجی خالہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر خالہ لپکیں۔ نیلما ان کے پیچھے تھی۔ وہ بروقت پہنچیں۔ عمران اسٹوڈیو سے نکل کر بھاگ ہی رہا تھا کہ نیلما نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ بچے نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارے لیکن پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور رونے لگا۔

"کوئی بات نہیں عمران۔ اگر تم سے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے تو بھی فکر نہ کرو۔ چلو، چل کر دکھاؤ کہ کیا ٹوٹا ہے۔" ماجی خالہ نے کہا۔

وہ تینوں اسٹوڈیو میں چلے آئے۔ "میں نے کوئی چیز نہیں توڑی لیکن آنٹی، آپ تو میری دوست تھیں۔ پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" عمران نے شکایتی لہجے میں کہا۔

نیلما نے اسٹوڈیو کا جائزہ لیا۔ ایک بڑا ایزل گرا پڑا تھا۔ وہ وہی پینٹنگ تھی، جس پر پچھلے روز اس نے سبز پردہ پڑا دیکھا تھا۔ پینٹنگ پھسل کر ایک طرف جا گری تھی۔ اس پینٹنگ کو دکھانے سے انکار کرتے ہوئے ماجی خالہ نے کہا تھا کہ وہ نامکمل ہے۔

ماجی خالہ نے بڑھ کر ایزل اٹھایا اور اسے کھڑا کیا۔ پھر انہوں نے تصویر اس پر آویزاں کی۔ عمران عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ نیلما تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ خالہ نے مخصوص سرخ سڑک پینٹ کی تھی، جو بلند و بالا درختوں کے درمیان بل کھاتی گزر رہی تھی لیکن تصویر کا مرکز ایک رقص کرتا ہوا وجود تھا، جو سفید رنگ میں لپٹا ہوا تھا۔ درختوں سے اُترتی ہوئی دُھند نے اس وجود کو قدرے دُھندلا دیا تھا۔ صرف اس کا

چہرہ واضح اور روشن تھا۔ وہ اپنے کندھے کے اوپر سے پلٹ کر دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

نیلما جان گئی کہ خالہ نے بانو کو پینٹ کیا ہے۔ تصویر ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ اس کے باوجود ماجی خالہ نے اُسے چھپا کر رکھا تھا۔

"یہ پینٹنگ آپ نے کب کی؟" نیلما نے خالہ سے پوچھا۔

ماجی خالہ نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "کوئی چار ماہ پہلے، اور یہی وہ چیز ہے جو میں تمہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اسے پینٹ کرتے ہوئے مجھے مطلق علم نہیں تھا کہ میں کیا پینٹ کر رہی ہوں۔ بس یہ تو جیسے خود بخود ہو گئی۔ میں نے اس پر پردہ ڈال دیا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر مجھ میں انجانا سا اضطراب لہریں لینے لگتا تھا۔ خاص طور پر بانو کی گمشدگی کے بعد ایسا کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔" پھر وہ عمران کی طرف مڑیں، جو بڑی توجہ سے سُن رہا تھا۔ "عمران.......... میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا بیٹے۔" انہوں نے اُس سے کہا۔ "میں تو سمجھی بھی نہیں کہ تم نے مجھے جھوٹا کیوں اور کس بات پر کہا ہے۔"

عمران انہیں تکتا رہا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں نے لکیریں کھینچ دی تھیں۔

"آپ نے کہا تھا، آپ کو معلوم نہیں کہ میری امّی کے ساتھ کیا ہوا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے۔ ان کے ڈھند میں جانے سے پہلے.......... آپ نے ان کی یہ تصویر بنائی تھی۔" اُس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"عمران.......... یہ تصویر تو صرف میرا تخیل ہے۔ میں نے تو تمہاری امّی کے جانے سے بھی پہلے یہ تصویر پینٹ کی تھی۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ یقین کرو بیٹے، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کیا تم اب بھی مجھے جھوٹا سمجھتے ہو؟"

عمران کی نظریں جھک گئیں۔ "نہیں آنٹی.......... مجھے یقین ہے آپ پر۔" اس نے کہا اور نظریں اٹھا کر نیلما کو دیکھا۔ "یہ یہاں کیوں آئی ہیں؟" اس نے ماجی خالہ سے پوچھا۔

"ممکن ہے، یہ تمہاری امّی کی تلاش میں ہماری مدد کر سکیں۔" ماجی خالہ نے جواب دیا۔ "تمہیں ان سے دوستی رکھنی چاہئے۔"

"مجھے یہ اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے ان سے.......... ان سے ڈر لگتا ہے۔"

"بے وقوفی کی بات ہے۔ تم تو انہیں جانتے بھی نہیں۔"

"مجھ سے ڈر لگتا ہے تمہیں۔ میں سمجھی نہیں!" نیلما نے لڑکے سے کہا۔

عمران اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ "آپ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں

"بری چیزیں بھی..........؟" اس نے کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا' جیسے اسے اپنی بات کی وضاحت کے لئے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

نیلما نے استعجابیہ نگاہوں سے ماجی خالہ کو دیکھا۔

"بچے بہت سی باتیں بڑوں کی بہ نسبت آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔" ماجی خالہ نے کہا اور پھر عمران سے مخاطب ہو گئیں۔ "ویسے عمران.......... تمہیں اِن کو ایک موقع تو دینا چاہئے ممکن ہے' قریب سے دیکھنے پر تم انہیں پسند کرنے لگو۔"

عمران نے غیر معمولی طور پر ٹٹولنے والی نگاہوں سے نیلما کو دیکھا' پھر نرم لہجے میں بولا۔ "میری امّی کو مردہ ثابت مت کیجئے گا۔"

اتنے خوف ناک خیال کے جواب میں نیلما کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی سے اندازہ ہو گیا کہ بچہ ابھی ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے گا اور اس کی یہ معصوم مگر خوف ناک التجا ساری عمر اس کی سماعت میں گونجتی رہے گی۔ کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر وہ تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے میز پر پڑی ہوئی ستارہ جاوید کی "سرخ سڑک" کی ایک جلد اٹھائی اور لڑکے کی طرف بڑھائی۔ "عمران.......... یہ میری سب سے پسندیدہ کتاب ہے۔" اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور جانتے ہو' میں شہر میں کام کیا کرتی ہوں۔ میں ننھے ننھے بچوں کو کہانیاں سناتی ہوں' یہ کتاب میں نے ہزاروں بار سنائی ہے۔ بچوں کو یہ کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ایک بات بتاؤ' ستارہ آنٹی تمہاری دوست تھیں نا؟"

عمران نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بغیر کوئی جواب دیئے باہر بھاگ گیا۔

"یہ مناسب وقت نہیں تھا۔" ماجی خالہ نے آہ بھر کے کہا۔ "اور قصور میرا ہے۔ مجھے بتا دینا چاہئے تھا کہ ستارہ کی لاش عمران ہی نے دریافت کی تھی۔ وہ اپنے اور ستارہ کے اس پسندیدہ مقام کی طرف گیا' جہاں دونوں اکثر جایا کرتے تھے۔ وہاں اس نے چھجے کے نیچے ستارہ کو پڑا دیکھا۔ وہ نیچے اترا کہ شاید ستارہ آنٹی کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ اب خود سوچو' اتنے سے بچّے کے لئے اپنی پسندیدہ ہستی کو اس طرح تنہائی میں مُردہ دیکھنا کتنے بڑے صدمے کا باعث ہوا ہو گا۔"

نیلما نے بچّے کی دہشت اور دُکھ کا تصور کیا اور لرز کے رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ اسے بچّے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔

"خالہ! میں اس بچّے پر ایک تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا اور باہر کی سمت

لپکی۔ وہ بیرونی پلیٹ فارم کی دیوار پر بیٹھا تھا۔ اس نے ٹانگیں باہر کی طرف لٹکائی ہوئی تھیں اور انہیں جھلا رہا تھا۔ نیلما اس کے برابر جا بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں "سرخ سڑک" اب بھی تھی۔

ماجی خالہ بھی پیچھے پیچھے آئیں مگر کچھ فاصلے پر رک گئیں۔

"میں عرصے سے ایک کام کرنا چاہتی تھی۔" نیلما نے عمران سے کہا۔ "لیکن تنہا نہیں کر سکتی۔ شاید تمہاری مدد سے ہو سکتا ہے۔"

"اور میری خواہش ہے کہ اگر کر سکتے ہو تو نیلی کی مدد ضرور کرو۔" عقب سے ماجی خالہ نے کہا۔

نیلما نے عمران کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ اور نیلما ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مین گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ صبح کی تازہ ہوا اور نرم دھوپ نے نیلما کو تازگی کا احساس دلایا۔

"تمہیں پتا ہے' جانور بور بھی ہو جاتے ہیں۔" اس نے عمران سے کہا۔ "میں نے خود دیکھا ہے' گائیں بور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قریب سے گزرتی کار کو وہ بے حد دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ تم نے کبھی غور کیا ہے اس بات پر۔"

"جی ہاں' اور کبھی کبھی وہ جنگلے سے گردن نکال کر باہر جھانکتے بھی ہیں۔"

"یہاں کہیں کوئی باڑہ ہے مویشیوں کا؟" نیلما نے پوچھا۔

"جی ہاں..........ہے۔"

"بس تو پھر بات بن گئی۔ دراصل گایوں کی فطرت میں تجسّس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ہر نئی اور انوکھی چیز میں دلچسپی لیتی ہیں۔ میں ایک دلچسپ تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔"

اب عمران بے حد رغبت سے اس کے ساتھ چل رہا تھا' وہ نیلما کو سڑک سے اتار کر کچے میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک باڑے کے سامنے کھڑے تھے۔ لکڑی کا جنگلا زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دونوں جنگلے کی باہر ہی رک گئے۔

"صبح بخیر رانو۔" عمران نے قریب کھڑی گائے کو مخاطب کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اکثر یہاں آتا رہا ہے۔

گائے نے سر گھما کر اسے دیکھا اور اپنی جگالی موقوف کر دی۔

"اور وہ چھلیا ہے۔" عمران نے ایک موٹی سی گائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیلما کو بتایا۔ چھلیا' عمران کو پُر خیال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک تیسری گائے بھی

دونوں گایوں کے قریب آگئی۔ بقول عمران کہ اس کا نام نازک تھا۔ اس نے اپنی تھوتھنی جنگلے سے نکالنے کی ناکام کوشش کی۔

"تم نے خوب نام رکھے ہیں ان کے۔" نیلما نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"نہیں، یہ نام تو امی کے رکھے ہوئے ہیں۔" عمران کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔

"چلو۔ اب تجربہ شروع کرتے ہیں۔ دیکھ لینا، کچھ ہی دیر بعد دوسری گائیں بھی یہیں جمع ہو جائیں گی۔" یہ کہہ کر نیلما نے کہانیوں کی کتاب کھولی اور پہلی کہانی بلند آواز میں پڑھنا شروع کی۔ "مدتوں پہلے کی بات ہے کہ ملک شام میں ایک لکڑہارا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ شہزادیوں سے زیادہ حسین۔ لکڑہارا صبح لکڑیاں کاٹنے جنگل جاتا تو سرخ کنکریلی پگڈنڈی سے گزرتا۔"

گائیں اب نیلما کو تک رہی تھیں۔ عمران خوش ہو کے بے ساختہ ہنسا اور نیلما کو احساس ہو گیا کہ اس نے بچے کی تسخیر کی طرف پہلا کامیاب قدم اٹھالیا ہے۔

نیلما کہانی پڑھتی رہی۔ اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ ڈرامائی ہو گیا۔ اعتماد دو چند ہو گیا۔

"سرخ پگڈنڈی کو بہت اچھا لگتا تھا کہ کوئی اس پر چلے۔ لکڑہارا اس پر سے روز گزرتا اور پگڈنڈی خوش رہتی.........."

ایک گائے جگالی کرنا بھول کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نیلما کو اس قدر ہمہ تن متوجہ سامعین پہلے کبھی نہیں ملے تھے۔ اس کا لہجہ اور زیادہ تاثر انگیز ہو گیا۔ پھر اس نے گایوں کو اسکیچ دکھانے کے لیے ورق الٹے۔

اچانک عقب سے تالیوں کی آواز سنائی دی۔ نیلما نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ اس قدر منہمک تھی کہ اسے اپنے عقب میں جیپ کے آکر رکنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ عمران کا باپ رضوان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے تالیاں بجا رہا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

عمران نے پلٹ کر باپ کو دیکھا اور بولا۔ "نیلی آنٹی کہانی بہت اچھی پڑھتی ہیں لیکن ستارہ آنٹی سے اچھی نہیں۔"

"یہ کہانی ہے ہی ستارہ کی۔ ظاہر ہے، ان سے اچھا کون پڑھ سکے گا۔" نیلما نے تائید کی۔

"لیکن انھوں نے اپنی کہانیاں گایوں کو کبھی نہیں سنائی تھیں۔" عمران نے گویا جائز کریڈٹ اسے دے ہی دیا۔

"میں ڈاک خانے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ چلنا چاہیں تو آجائیں۔" رضوان نے کہا۔

نیلما نے عمران کو دیکھا۔ وہ جانے کے موڈ میں تھا چنانچہ اس نے بھی ہامی بھر دی۔

عمران اچھل کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ نیلما بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں رضوان کی سنجیدگی کو جائز قرار دیا۔ اس پر جو بیتی تھی اور بیت رہی تھی، اس میں اسے ڈپریس ہونا ہی تھا۔ ایسے میں کون مسکراتا ہے۔

"آپ ماجدہ باجی کے پاس کتنے دن قیام کریں گی؟" راستے میں رضوان نے پوچھا۔

"میں تو آج صبح ہی واپس جا رہی تھی لیکن عمران کی وجہ سے ارادہ بدل دیا۔ بہر حال زیادہ دن نہیں رکوں گی۔" نیلما نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد رضوان نے ڈاک خانے کے باہر جیپ روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ عمران اور نیلما جیپ ہی میں بیٹھے رہے پھر عمران اتر کر ایک طرف چل دیا ذرا دیر بعد رضوان کچھ خطوط لے کر واپس آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ونڈ شیلڈ کو گھورنے لگا۔ پھر اچانک بولا۔ "گزشتہ رات آپ کے جانے کے بعد شہناز نے مجھے اور جاوید کو آپ کے متعلق بتایا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ یہاں سے جلد از جلد کیوں جانا چاہتی ہیں۔"

ہاتھ میں موجود کتاب پر نیلما کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ آگے کیا ہو گا۔ اس نے خود کو مزاحمت کے لئے تیار کر لیا۔

"آپ تو جانتی ہی ہیں کہ ستارہ کی لاش عمران ہی نے دریافت کی تھی۔" رضوان نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اور اب شاید اپنی ماں کی لاش بھی وہی دریافت کرے گا۔ میں جاوید کی طرح سائیکک نہیں، لیکن اس سلسلے میں مجھے اعتماد نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود آپ مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں؟" نیلما نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ بالکل اچانک غیر متوقع طور پر مسکرایا۔ اس ایک لمحے میں اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی۔ حالانکہ وہ دوستانہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ "اگر ماجدہ باجی درست کہتی ہیں اور آپ میں صلاحیت ہے تو آپ کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔"

نیلما چڑ گئی۔ "میں اس سلسلے میں پابند تو نہیں ہوں میں نے یہ صلاحیت طلب تو نہیں کی تھی اور پھر.........."

"ملوث ہونا خطرات کو دعوت دینا ہے۔ آپ کیوں خود کو داؤ پر لگائیں۔" رضوان نے اس کی بات مکمل کر دی۔ "لیجئے۔ عمران آگیا۔ اس کے سامنے کچھ نہ کہئے گا۔ اب میں آپ کو آپ کی خالہ کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔"

"کھسکئے.......... مجھے جگہ دیجئے۔" عمران نے آتے ہی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے نے نیلما کو یوں گڑبڑایا کہ اسے خیال ہی نہ رہا کہ اتر کر پہلے عمران کو بیٹھنے دے، پھر خود بیٹھے۔ نتیجتاً اب وہ رضوان کے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے پورے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ رضوان میں کہیں گہرائی میں کوئی نہ کوئی عجیب سی بات تھی ضرور۔ جو اسے بے چین کر رہی تھی۔

جیپ ماجی خالہ کے گھر کے سامنے رُکی۔ وقار اس بار بھی چھت پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ "پاپا.......... مجھے ان سے کچھ بات کرنا ہے۔ کرلوں؟" عمران نے وقار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رضوان سے پوچھا۔

"کرلو۔ ویسے میرا خیال ہے، وقار کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔" رضوان نے جواب دیا عمران بھاگتا ہوا وقار کی طرف چلا گیا۔

"آپ میرے گھر چلیں اور جس حد تک بتا سکتی ہیں، مجھے بتائیں۔" رضوان نے نیلما سے کہا۔

اس کے غیر جذباتی لہجے میں عجیب سی بے پروائی تھی۔ آنکھوں میں چیلنج تھا۔ اس کے باوجود دبے ہوئے جذبات کسی حد تک ظاہر ہو رہے تھے۔ نیلما کو وہ شخص اچھا نہیں لگا تھا لیکن اسے اس کے دکھ اور پریشانی کا بہرحال احساس تھا اسی لئے وہ انکار نہ کر سکی۔

"میں کوشش کروں گی۔ ویسے میرا خیال ہے، میں آپ کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتی۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "چلئے.........."

☆======☆======☆

پہاڑی سڑک پر کچھ اوپر ایک چٹانی چھجا تھا۔ رضوان کا کاٹیج اس چھجے کے پیچھے بنا ہوا تھا۔ اسی لئے ماجی خالہ کے مکان سے اسے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ رضوان نے چوبی گیٹ سے گزارنے کے بعد کاٹیج کے عین سامنے جیپ روکی۔

پہلا کمرا مکان کی پوری چوڑائی پر محیط تھا اور بطور ڈرائنگ روم استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اندر سے ایک عورت برآمد ہوئی۔

"کیا حال ہے عذرا؟" رضوان نے عورت سے کہا اور پھر نیلما سے بولا۔ "یہ عذرا ہے، ہم باپ بیٹے کا یہی خیال رکھتی ہے۔"

عذرا پکی عمر کی خوش شکل عورت تھی۔ اپنے لباس اور انداز سے نفاست پسند معلوم ہوتی تھی۔

"اوپر چلیں۔ میں آپ کو دوپٹہ دکھادوں۔" رضوان نے نیلما سے کہا۔

"ابھی نہیں۔ میں بہت تیز کبھی نہیں چلتی۔ پہلے مجھے راستہ سونگھنا پڑتا ہے۔ یہ بتائیں، آپ کی بیگم کا کوئی علیحدہ کمرا ہے یا ان کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

"جی ہاں۔ اس کا کمرا اوپر ہے۔ آپ دیکھنا چاہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔ ذاتی کمرے اپنے مکینوں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتے ہیں۔ دوپٹے کو چھُونے سے پہلے میں کسی حد تک آپ کی بیگم کو محسوس کرلوں تو بہتر ہو گا۔" نیلما نے کہا۔

زینہ چڑھتے ہوئے وہ کچھ اضطراب محسوس کر رہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ رضوان کو درحقیقت اس کی صلاحیت پر یقین نہیں ہے۔ شاید وہ ماجی خالہ کے اصرار کی وجہ سے اس تجربے پر رضامند ہوا تھا۔

"بانو نے اپنے لیے وہ کمرا منتخب کیا تھا جس کی بالکونی سامنے والے حصے میں ہے۔" رضوان نے ایک کمرے کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔

نیلما نے دروازے کی چوکھٹ پار کی اور ساکت کھڑی ہو گئی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا۔ اس پر لیٹ کر سامنے والے پہاڑ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز کے اوپر ایک پینٹنگ آویزاں تھی۔ وہ پینٹنگ یقینی طور پر ماجی خالہ کی بنائی ہوئی تھی۔ اس میں بھی سرخ سڑک موجود تھی، جس کے پیش منظر میں، درخت ہی درخت استادہ تھے۔ پس منظر میں نیلا آسمان تھا، جس پر کہرا اٹھتی دکھائی دی رہی تھی، کہر سے لپٹی ہوئی دھنک کی کمان تھی۔ تصویر کا مرکزی خیال سڑک نہیں بلکہ دھنک تھی۔

"واہ..........! سحر میں جکڑ لینے والی تصویر ہے۔" نیلما نے بے ساختہ تبصرہ کیا۔ "یہ خالہ کی بہترین تصاویر میں سے ہے۔"

"بانو نے بھی بالکل یہی تبصرہ کیا تھا اس پر۔ وہ کہتی تھی کہ اس دھنک میں سے کوئی آواز اُبھرتی ہے اور اس سے باتیں کرتی ہے۔ دراصل بانو کے مزاج میں عجیب سی پُراسرایت ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کی شخصیت کا جزو ہے۔ میں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔"

نیلما کو اس کے لہجے میں کوئی عجیب سی بات محسوس ہوئی، دکھ سے بھی کچھ سوا۔ کوئی پچھتاوا سا۔ "اب آپ مجھے وہ دوپٹہ دکھائیے۔" اس نے رضوان سے کہا۔

"وہ اسی کمرے میں ہے۔ میز کی دراز میں۔" رضوان نے کہا اور میز کی طرف بڑھ گیا۔

"رہنے دیں۔ میں خود ہی نکال لوں گی۔ اب آپ اس کمرے سے چلے جائیں۔ میں اس دوپٹے کو مکمل تنہائی میں چھونا چاہتی ہوں۔"

رضوان کے جانے کے بعد نیلما نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے وجود میں عجیب سا سناٹا اتر آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور کھلی ہوئی دراز میں رکھے دوپٹے کو چھو لیا۔ ریشمی دوپٹہ یوں سرسرایا' جیسے وہ کوئی زندہ ہستی ہو اس کا لمس نیلما کو دہکتے ہوئے انگارے جیسا لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ ہاتھ کھینچے اور بھاگ کر کمرے سے نکل جائے لیکن اس نے کوشش کر کے خود کو باز رکھا۔ البتہ اس نے دوپٹے پر سے ہاتھ ہٹا لئے۔

اس کے ذہن میں بہت تیزی سے خیالات کے ہیولے ابھرے۔ رگ و پے میں سیال دہشت سی تیر گئی لیکن اس کے تصور میں بانو کی شبیہہ اُبھری' نہ کوئی علامت۔ یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں مل سکتی ہے۔ اسے کہاں ڈھونڈا جائے' البتہ کوئی شیطانی قوت اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلا رہی تھی۔

شاید بے خبری میں اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی کیونکہ دروازے پر آہٹیں ابھریں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ رضوان دروازے پر کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" رضوان نے پُرتشویش لہجے میں اس سے پوچھا۔

اسی وقت نیلما کو احساس ہوا کہ دوپٹہ دراز میں نہیں بلکہ فرش پر پڑا ہے۔ "میں باہر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

رضوان نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے کمرے سے نکال لایا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس انسان ہونے کے ناتے نیلما کو بہت اچھا اور حوصلہ افزا لگا۔

رضوان اسے کاٹیج سے باہر لان میں لے آیا' جہاں کرسیاں پڑی تھیں۔ نیلما ایک کرسی پر ڈھے سی گئی۔ "مجھے افسوس ہے۔ مجھے چند لمحوں کے آرام کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔

رضوان خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیلما کو احساس تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے سوالات کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ چند لمحے بعد نیلما نے بولنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔ "میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی رضوان۔ مجھے

افسوس ہے' جو کچھ آپ جاننا چاہتے ہیں' میں بتانے سے قاصر ہوں۔"

"لیکن آپ نے کچھ محسوس تو کیا ہے۔ آپ بلا وجہ تو خوف زدہ نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے اس خوف کی وجہ تو بتا دیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا' کیسے بتاؤں!" نیلما نے بے بسی سے کہا۔ "اس سے پہلے میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ آپ کی بیوی کا دوپٹہ بے حد خراب.......... کسی شیطانی شخصیت کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ وہ شخصیت اس قدر شیطانی ہو گی کہ اس نے دوپٹے پر موجود آپ کی بیوی کے لمس تک کو جلا ڈالا ہے۔ میں اس سلسلے میں فوری طور پر اپنی خالہ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ رضوان.......... میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔"

"میں نے یہ گمان بھی نہیں کیا تھا کہ آپ میری مدد کر سکتی ہیں۔" رضوان نے سرد لہجے میں کہا۔ "چلئے.......... میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

☆======☆======☆

ماجی خالہ کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر ان کے چہروں کو دیکھا۔ اُن کی نگاہوں میں تفہیم کی چمک اُبھری۔ "تو تم بانو کے دوپٹے کو چھو کر آ رہی ہو۔ ہے نا؟" انہوں نے نیلما سے پوچھا۔

"لیکن میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکی اور آپ سے گفتگو میرے لئے ضروری ہو گئی ہے۔"

رضوان واپسی کے لئے پلٹا۔ نیلما نے محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا ہے۔ جیسے اس کا خیال ہو کہ اسے نظر بھر کر دیکھنا بھی اس کے دکھوں میں اضافے کا موجب ہو گا۔ اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر اس کا شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔

"رضوان نے صرف بیوی ہی نہیں' ایک بیٹی بھی گنوائی ہے۔" ماجی خالہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"آؤ.......... سکون سے بیٹھ کر سنو۔" ماجی خالہ اسے کچن سے نکال لائیں اور باہر پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "جب تک تمہیں بانو کی شخصیت سمجھنے کا موقع نہیں ملے گا' تم رضوان کی کوئی مدد نہیں کر سکو گی۔"

"یہ تو ویسے ہی ثابت ہو گیا ہے کہ میں رضوان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

ماجی خالہ نے سنی اَن سنی کر دی اور اپنی بات جاری رکھی۔ "بانو' رضوان سے بے

حد مختلف تھی۔ تخیلاتی اور شدید جذبات پرست۔ درحقیقت اس کے اندر ایک چھوٹی سی بچی کی شخصیت بھی تھی جو اس کے ساتھ بڑی نہیں ہوئی' بچی ہی رہی۔ لوگ اس کی شخصیت کے اس معصوم جزو کا کبھی احترام نہ کر سکے۔"

"مجھے تو اس کی معصومیت پر ہی یقین نہیں۔" نیلما نے کہا۔ "آپ نے اپنی پینٹنگ میں جو کچھ اجاگر کیا ہے' وہ معصومیت ہرگز نہیں۔ آپ نے تو ایک ایسی عورت کو پینٹ کیا ہے' جس سے ان گنت راز وابستہ ہوں۔"

"کبھی کبھی میرے برش وہ کچھ بھی دکھا دیتے ہیں' جو مجھ سے پوشیدہ ہوتا ہے۔"

"آپ بانو کو پسند کرتی تھیں؟"

"میں نہیں سمجھتی کہ بانو اچھی ماں تھی۔ جو کچھ عمران اس سے چاہتا تھا' وہ اسے کبھی نہ دے سکی۔"

"کسی کو بانو سے اتنی نفرت ہو سکتی ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ کیا آپ ایسے کسی شخص کو جانتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ یہ امن پسندوں کی نگری ہے۔"

"یہ جگہ بے شک پُرسکون ہے مگر یہاں کے باسی پُرسکون نہیں ہیں۔"

ماجی خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ فی الوقت تو کھانا پکانا ہے۔ تمہیں یاد ہے' وقار کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے گا۔"

نیلما کو تو یہ یاد بھی نہیں تھا۔ سچ یہ ہے کہ اسے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ وہ دوپہر کا کھانا ماجی خالہ کے ساتھ کھائے گی۔ وہ تو صبح ہی یہاں سے رخصت ہونا چاہ رہی تھی۔

ماجی خالہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں' بولیں۔ "نیلی.......... چند روز رک جاؤ۔ تم نہیں جانتیں کہ ہمیں تمہاری کتنی ضرورت ہے۔"

نیلما دل ہی دل میں ہنس دی۔ ماجی خالہ نہیں جانتی تھیں کہ اب اسے روکنے کے لیے اصرار کی قطعی ضرورت نہیں۔

☆======☆======☆

وقار بے حد کم گو تھا۔ لہٰذا کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ پھر اس خاموشی کو وقار ہی نے توڑا۔ "سنا آپ نے۔ عمران کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو دیکھا ہے۔"

ماجی خالہ لقمہ منہ تک لے جانا بھول گئیں۔ ان کا ہاتھ رک گیا۔ "یہ تو رضوان کے لیے اور مشکل کھڑی ہوئی۔ اس لڑکے کا تخیل بہت زرخیز ہے۔ لہٰذا اس نے تخیل کے

زور پر اسے زندہ دیکھنا شروع کر دیا ہے۔" وہ بولیں۔

"دیکھا تو میں نے بھی ہے لیکن وہ بانو نہیں تھی۔" وقار نے سرسری انداز میں کہا۔

"تفصیل سے بتاؤ۔" ماجی خالہ نے اسے اکسایا۔

"میں لوگوں کو ان کی چال سے پہچانتا ہوں۔ اسی لیے یقین سے کہہ سکتا ہوں بانو نہیں تھی۔"

"آپ نے دیکھا کیا تھا؟" نیلما کا تجسس بھڑک اٹھا۔

"میں نے جس وقت اسے دیکھا' میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ اس کا چلنے کا انداز بانو سے بالکل مختلف ہے۔ بانو کی چال بہت خوب صورت تھی.......... رقاصاؤں جیسی۔ وہ پنجوں کے بل چلتی تھی اور لگتا تھا' جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ جیسے اس کے پاؤں زمین پر پڑ ہی نہ رہے ہوں۔ جبکہ وہ جو کوئی بھی تھی' بے ڈھنگے پن سے چل رہی تھی۔ نہ میرا وہم تھا' نہ کوئی روح۔ اور وہ چاہتی تھی کہ میں اسے دیکھ لوں لیکن میرے بہت قریب بھی نہیں آنا چاہتی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے قریب سے دیکھوں۔"

"تو وہ تھی کیا بلا؟" ماجی خالہ نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ ممکن ہے' کوئی مرد ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن عمران نے اسے دیکھا ہو گا تو اسی روپ میں جس میں وہ دیکھنا چاہتا ہے۔"

"آپ نے چہرہ نہیں دیکھا؟" نیلما نے پوچھا۔

"نہیں۔ چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔" وقار نے جواب دیا۔ پھر ماجی خالہ سے بولا۔ "آپ کو پتا ہے' شانی واپس آگئی۔"

"بانو کی بلی؟ وہ تو بانو کے بعد غائب ہی ہو گئی تھی!" ماجی خالہ نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ وہ آج صبح کلثوم کے گھر واپس آئی ہے۔ ہڈیوں کی مالا بن کر رہ گئی ہے۔ لگتا ہے' مدتوں سے بھوکی ہے۔"

"آخر اس تمام عرصے میں شانی کہاں رہی ہو گی؟" ماجی خالہ نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "نیلی.......... کیا خیال ہے' کلثوم کی طرف چل کر شانی کو ایک نظر دیکھ نہ لیں؟ پھر عمران سے بات کریں گے۔"

کھانے کے بعد وقار جا ہی رہا تھا کہ نیلما نے اس سے پوچھا۔ "کیا واقعی آپ نے جنگل میں کسی کو دیکھا تھا؟"

وقار چند لمحے اسے عجیب سی........ ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"ممکن ہے، وہ محض میرا خیال ہو۔ یہ کبھی عجیب شے ہے بعض اوقات آدمی کو عجیب عجیب دھوکے دیتی ہے۔"

☆======☆======☆

درختوں کے درمیان بل کھاتی، مکان کی طرف بڑھتی وہ پگڈنڈی تقریباً عمودی تھی لیکن ماجی خالہ کے قدم اعتماد سے اُٹھ رہے تھے۔ سفر ڈھلوانی تھا۔ نیلما خالہ کے پیچھے پیچھے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ جہاں راستے میں ایک بہت بڑا گول پتھر حائل تھا، وہاں پگڈنڈی گھوم کر پہاڑ کے اور قریب ہو جاتی تھی۔ ماجی خالہ کی رفتار کافی تیز تھی۔ ایک مرحلے پر نیلما سرخ پگڈنڈی پر تنہا رہ گئی۔ دیودار کے درختوں سے گھری وہ پگڈنڈی کسی راہداری کی طرح تھی۔ یہ خیال نیلما کو اچانک ہی آیا اور اس کے ذہن پر پوری طرح محیط ہو گیا۔

یہ راستہ کہیں میرے خوابوں کی سرخ فرش والی راہداری تو نہیں۔ یہ وہ جنگل تو نہیں، جہاں خواب سچے ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ وہی جگہ ہے، جہاں خواب میں کوئی میرا پیچھا کرتا ہے۔ نقصان پہنچانے کی غرض سے۔ وہ سوچتی رہی۔ پھر اس کے ذہن پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ فوراً بھاگ جانا چاہئے۔

اس نے قدم تیز کر دیئے تاکہ خالہ نگاہوں کے سامنے رہیں۔ اپنی دھڑکنوں کی دھمک اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ خواب حقیقت تو نہیں ہوتے۔ انسان کے باطن میں چھپا ہوا ہر خوف خوابوں میں جگہ بناتا ہے۔ یہ سب سوچنے کے باوجود اس کے قدم سُست نہیں پڑے۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ صبح ہی شام نگر سے نکل کیوں نہ گئی۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر اسے چشمہ نظر آیا۔ ماجی خالہ اس کے انتظار میں چشمے کے کنارے رُک گئی تھیں۔ چشمے پر لکڑی کے تختوں کا ایک چھوٹا سا پُل تھا۔ پُل کے اس طرف باڑے میں پہاڑی خچر چر رہے تھے۔ باڑے کے جنگلے پر عمران بیٹھا ایک خچر کو دیکھ رہا تھا۔

"یہاں آیئے........ اور پیلو کو پیار دیجئے۔" عمران نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔ "اس پیلو کو پیار کرنے کا بڑا شوق ہے۔"

نیلما، عمران کی طرف گئی اور اس کے بے حد اصرار پر خچر کی طرف اپنا رخسار

بڑھایا۔ پیلو نے واقعتاً اس کا رخسار چوما اور مسرت آمیز انداز میں ہنہنایا۔

ملحقہ مکان سے ایک خاتون برآمد ہوئی۔ اس نے ماجی خالہ کو سلام کیا اور بولی۔ "یہ تمہاری بھانجی نیلما ہے نا؟"

پھر اس نے نیلما کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "آؤ........ اندر چلو۔ میں نے ابھی ابھی چائے بنائی ہے۔" اس نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

عمران بھی جنگلے سے اُتر آیا۔ "آپ کو پتا ہے، شانی واپس آ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے، امی نے اسے آنے کی اجازت دے دی ہو گی۔ کلثوم خالہ، میں بھی اندر آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" کلثوم نے ماجی خالہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر شانی بانو کے ساتھ تھی تو میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ بانو نے اس کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا۔ تم بلی کا حال دیکھو گی تو دہل جاؤ گی اور میرے خیال میں بانو ایسا نہیں کر سکتی........"

مکان پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اندر جلتے ہوئے اسٹوو کے قریب گندی اُون کا بڑا سا گولا پڑا ہوا تھا۔ عمران اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اچانک اُون کے گولے میں سے ایک سر اور اگلے پنجے برآمد ہوئے۔ تب پتا چلا کہ وہ بلی ہے۔ بلی کی نیلی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا، جیسے وہ بہت کچھ جانتی ہو۔

"کاش........! اس بلی کو زبان میسر ہوتی تو بتاتی کہ یہ کہاں تھی اور بانو پر کیا گزری ہے۔" کلثوم نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"امی بالکل خیریت سے ہیں۔ اب تو مجھے انہیں تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" عمران بولا۔

ماجی خالہ نے معنی خیز نظروں سے نیلما کو دیکھا۔ پھر کلثوم سے بولیں۔ "باہر کوئی ملے تو رضوان کو بلوا لوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔ عمران بلی کی پشت سہلاتا اور اسے چمکارتا رہا۔ کچھ دیر بعد ماجی خالہ واپس آ گئیں۔ "رضوان کچھ دیر میں آ جائے گا۔" انہوں نے اعلان کیا۔

بلی نے دوبارہ سر جسم میں چھپایا اور شاید سو گئی۔ عمران نے کلثوم کو "سرخ سڑک" دکھائی اور گایوں کو کہانی سنانے کی تفصیل بتانے لگا۔ "کیوں نہ خچروں پر بھی تجربہ کیا جائے؟" اس نے آخر میں تجویز پیش کی۔

"کوشش کر لو۔ ویسے گایوں کی نسبت خچروں میں ارتکاز کم ہوتا ہے اور وہ بہت جلدی بھڑک جاتے ہیں ویسے تجسس تو ان میں بھی کم نہیں ہوتا۔" کلثوم نے جواب دیا۔

عمران کتاب لئے باہر بھاگ گیا۔

"اب بتاؤ ماجدہ' تم کیسے راستہ بھول گئیں؟" اس کے جانے کے بعد کلثوم نے باجی خالہ سے پوچھا۔ پھر اس نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔

"رضوان کو آنے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ بات اس کے سامنے ہو۔"

اسی لمحے آہٹ سنائی دی اور رضوان دروازے پر نظر آیا۔ اس کا ہاتھ عمران کے کندھے پر تھا۔ "شانی کسے ملی اور کیسے ملی؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

شانی نے اپنا نام سن کر سر اٹھایا اور خرخرانے لگی۔ اس کی دُم بھی حرکت میں آگئی۔ عمران نے اسے چمکارا۔

"اندر آجاؤ نا۔" کلثوم نے کہا۔ "میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" پھر اس نے شانی کی آمد کی تفصیل سنائی۔ "یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ اس عرصے میں کہاں رہی ہے۔" اس نے آخر میں کہا۔

عمران نے آگے بڑھ کر بلی کو گود میں اٹھالیا۔ "امی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ ان کا جب جی چاہے گا' واپس آجائیں گی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر رضوان' عمران کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔ "بیٹے.......... تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لئے کہہ سکتا ہوں پاپا کہ میں نے کل انہیں جنگل کے پاس والی چراگاہ میں دیکھا تھا۔ اس وقت اندھیرا ہو رہا تھا اور بادل نیچے اُتر رہے تھے لیکن میں نے امّی کو صاف طور پر دیکھا۔ وہ سفید لباس میں تھیں۔ میں نے انہیں پکارا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور درختوں کی طرف چلی گئیں۔ میں اُن کے پیچھے بھاگا لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔" بچّے کی آنکھوں میں مایوسی کے آنسو جھلملانے لگے۔

کلثوم نے بڑھ کر نہایت نرمی سے بلی کو عمران کی گود سے لے کر فرش پر اتار دیا۔

رضوان نے بیٹے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ پھر اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میرے بیٹے' تم نے خواب دیکھا ہو گا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "آدمی جو کچھ شدت سے چاہتا ہے' بڑی آسانی سے دیکھ بھی لیتا ہے لیکن میرے بیٹے' ہمیں حقیقتوں اور خوابوں کو الگ الگ سمجھنا چاہیے۔"

عمران نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور تند لہجے میں بولا۔ "وہ خواب نہیں تھا۔ میں نے اپنی امی کو سچ مچ دیکھا ہے۔" پھر اس سے پہلے کہ رضوان اُسے روک سکتا'

وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔

"جانے دو۔ میں بعد میں اسے سمجھا لوں گا۔" رضوان نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"نیلی! تم اکیلی گھر جا سکتی ہو؟ میں کچھ دیر بعد واپس آؤں گی۔" ماجی خالہ نے نیلما سے پوچھا۔

نیلما سمجھ گئی کہ وہ خالہ کلثوم سے بات کرنا چاہتی ہیں لیکن اس راستے سے دوبارہ گزرنے کا تصور ہی بے حد ہمت شکن تھا۔ وہ خوابوں کی اس راہداری میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی.......... کم از کم ہوش و حواس کے عالم میں ہرگز نہیں۔

اس کی ہچکچاہٹ سبھی نے بھانپ لی۔

رضوان اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں' میرے ساتھ چلی چلئے۔" اس کے لہجے میں ایسی سرد مہری تھی' جیسے وہ کوئی ناخوش گوار فرض پورا کر رہا ہو۔

"شکریہ۔" نیلما نے آہستہ سے کہا۔ اسے اس راستے سے تنہا گزرنے کے مقابلے میں وہ سرد اور توہین آمیز لہجہ قبول تھا۔

وہ دونوں کلثوم کے گھر سے نکل آئے۔ دروازے کے باہر ایک ٹوٹا ہو پتلا سا دو شاخہ پڑا تھا۔ رضوان نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ پھر انہوں نے تختوں کا پُل پار کیا۔ آگے.......... راستے میں رضوان نے نیلما کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ "آپ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گی؟"

نیلما کو اس کے لہجے میں التجا کی بجائے چیلنج محسوس ہوا لیکن وہ اس اذیت کو بھی سمجھ سکتی تھی' جس سے وہ دوچار تھا۔ جو شخص اندھیروں میں کسی کی جستجو میں ہاتھ پیر مار رہا ہو اور اسے کچھ نہ ملتا ہو تو وہ چڑ چڑا ہو ہی جاتا ہے۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شروع کہاں سے کروں۔" اس نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کی بیگم کیسی تھیں۔ مزاج کیا تھا ان کا۔ سچ پوچھیں تو میرا خیال ہے' میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔"

"میرا خیال ہے' پیش بیں لوگوں کو ان کے ہر سوال کا جواب ان کی قوتیں ہی دیتی ہیں۔"

نیلما کو اس کا لہجہ مضحکانہ لگا۔ تاہم اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ "میں خود کو پیش بیں نہیں سمجھتی۔ میری صلاحیت بے حد محدود ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کبھی کبھی مجھے اچانک کوئی مخفی بات معلوم ہو جاتی ہے۔"

"تو دوپٹہ ناکافی ثابت ہوا۔ حالانکہ اس کے لمس پر آپ کا ردِ عمل انتہائی غیر معمولی

تھا۔"

"اس دوپٹے سے بانو صاحبہ کی وابستگی کسی اور لمس نے مکمل طور پر ختم کر دی ہے۔ اس سے مجھے ان کے متعلق کچھ پتا نہیں چل سکتا۔"

اب وہ دوپٹے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ ذہنی کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ اب وہ اس راستے پر تھے' جو جنگل میں سے گزرتا تھا۔ نیلما کو اپنے وجود میں خوف ٹھاٹھیں مارتا' امنڈتا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اسے تعاقب کا احساس ہوا اور پشت پر چیونٹیاں سی سرسرانے لگیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پگڈنڈی کے اطراف میں دیودار کے درخت شاخوں سے شاخیں ملائے چھت سی بنائے کھڑے تھے۔ ہر طرف سکوت تھا۔ کہیں کہیں دھوپ گھنے درختوں میں راستہ بنا کر زمین کو چوم رہی تھی۔ مجموعی طور پر نیم تاریکی کی سی کیفیت تھی۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ ہوا کو بھی نیچے اترنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ صرف اوپر کہیں پتوں کی سرسراہٹ ہوا کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ نیچے سرخ مٹی کی راہگذر دیکھ کر اسے پھر اپنا خواب یاد آ گیا۔

اچانک خوف نے اسے پوری طرح گھیر لیا۔ اس نے رضوان کو نظرانداز کر کے پہاڑی کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ رضوان نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ "آخر آپ کو پریشانی کیا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ پھر نرمی سے بولا۔ "اس سلسلے میں مجھے کچھ بتائیں گی نہیں؟"

وہ یہ بات ماجی خالہ کو نہیں بتا سکی تھی تو اسے کیسے بتاتی۔ اس سلسلے میں تو وہ کسی سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ خوف تو اس کے اندر' بہت اندر کا خوف تھا۔ بہت گہرائی میں چھپا تھا۔ اس سے تو اسے خود ہی نمٹنا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رضوان آگے بڑھ گیا۔

"اب چڑھائی آ رہی ہے۔" اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

"ہم کچھ دیر رک کر ستائیں گے۔ آپ ویسے بھی ہانپ رہی ہیں۔ اس موڑ کے آگے ایک چٹان ہے۔ اس پر بیٹھ کر کچھ دیر آرام کر لیں۔"

موڑ والی چٹان پر نیلما گھٹنے کھڑے کر کے بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ اور چہرہ گھٹنوں پر ٹکا لیا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ رضوان خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ سننے کا منتظر۔ اس وقت اس کی موجودگی بری نہیں لگ رہی تھی۔

نیلما سوچتی اور الجھتی رہی کہ کچھ بولے یا نہ بولے۔ پھر بلا ارادہ وہ بولتی گئی۔ "میں

ایک خواب بار بار دیکھتی ہوں۔ اس خواب میں میں ہمیشہ خود کو ایک تنگ اور خوں رنگ راہداری میں بھاگتے دیکھتی ہوں۔ راہداری اس راستے جیسی ہوتی ہے۔ اطراف کی دیواریں مجھے آگے بڑھتی محسوس ہوتی ہیں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ آگے کی سمت بھاگنے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہوتا اور بھاگنے پر مجبور مجھے یہ احساس کرتا ہے کہ کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں رک گئی تو پکڑی جاؤں گی اور بے حد عبرت ناک انجام سے دوچار ہوں گی لیکن عالم یہ ہوتا ہے کہ میں ہانپ رہی ہوتی ہوں۔ پھیپھڑوں میں جیسے آگ بھری ہوتی ہے۔ سانس لینا بھی دوبھر ہوتا ہے۔ بس اس مرحلے پر میں جاگ جاتی ہوں۔ مگر خوف مجھ پر بہت دیر تک حاوی رہتا ہے۔ خواب مہینے میں دو ایک بار نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی تو اس کی وجہ سے مجھے سونے سے خوف آنے لگتا ہے۔ نیند ہی نہیں آتی۔" اس نے نظریں اٹھا کر رضوان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنگینی تھی لیکن ہمدردی کا تاثر بھی تھا۔

"اگر حقیقی زندگی میں یہ صورت حال درپیش ہو تو بھی آپ بھاگیں گی ہی۔" رضوان نے کہا۔

"لیکن خواب میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے' جب میرے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے ہیں اور سانس یوں اکھڑنے لگتی ہے' جیسے رک جائے گی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ نیلما سوچ رہی تھی۔ خاموشی طویل ہونے لگی تو رضوان نے غیر متوقع طور پر اپنے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ "حال ہی میں' میں نے بھی ایک خواب بار بار دیکھا ہے۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "میں گہری تاریکی دیکھتا ہوں۔ جیسے چاند ستاروں سے محروم برسات کی رات۔ پھر اس تاریکی میں سے کوئی آواز مدد کے لیے پکارتی ہے۔ ہر بار ایک ہی آواز ہوتی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر بولا۔ "اور وہ آواز بانو کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ بانو کی روح میرے بہت قریب ہے اور مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن کوئی قوت اس کی راہ روکے کھڑی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی روح کو کیسے آزاد کراؤں۔ اس کے لیے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے۔ نیلما...... آپ اس سلسلے میں مدد نہ سہی' مدد کی کوشش تو کر سکتی ہیں...... پلیز!"

وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بڑی سادگی سے اصل بات کہی تھی۔ ورنہ نیلما کو اس سے پہلے اس کا رویہ ہمیشہ معاندانہ محسوس ہوا تھا۔ اب اس لہجے کے جواب میں وہ کم از

کم کوشش سے تو انکار نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ اسے اعتماد نہیں تھا کہ وہ اپنی صلاحیت کے ذریعے اس کی کوئی مدد کر سکتی ہے۔ "یہ تجربے کی وہ زمین ہے' جس پر میں نے کبھی قدم نہیں رکھے۔ مما ہمیشہ مجھ کو سمجھاتی رہی ہیں کہ مجھے اپنی صلاحیت کو نشوونما سے گزارنا چاہئے۔ اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال.......... آپ کے لیے میں کوشش ضرور کروں گی۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔"

"شکریہ۔" رضوان نے کہا۔ نیلما نے محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر اپنے سخت کے خول میں بند ہو چکا ہے لیکن اب نیلما کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

"جہاں تک میرے خواب کا تعلق ہے' مجھے یقین ہے کہ اس کا اس جنگل سے گہرا تعلق ہے۔ شاید یہ مسئلہ یہیں حل ہو گا' شاید اس کے بعد یہ خواب مجھے کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ اب میں بھاگنا بھی نہیں چاہتی۔ جو ہونا ہے' ہو جائے۔ اس کے بعد ہی میں آزاد ہو سکوں گی۔" اس نے کہا۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ رضوان اس کے بولنے یا اٹھنے کا منتظر تھا۔ پھر اس سکوت کو نیلما ہی نے توڑا۔ "کیا آپ واقعی اپنی بیگم کو تلاش کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

رضوان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ "یہ ایسا سوال تو نہیں کہ آپ کو پوچھنے کی ضرورت پڑے۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

نیلما نے سوچا' یہ کوئی مناسب جواب بھی نہیں ہے۔ رضوان اچانک اٹھ کر پگڈنڈی پر چل دیا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ آگے پیچھے چلتے رہے۔ اپنے اپنے اندر کے کھنچاؤ اور کشیدگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ وہ کوئی آسان اشتراک نہیں تھا' جس نے انہیں یکجا کیا تھا۔

☆======☆======☆

اس رات کھانے کے بعد نیلما اپنے کمرے میں صورت حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ وہ بانو کی گمشدگی کا معاملہ حل کئے بغیر شام نگر سے نہیں جا سکتی تھی۔ البتہ یہ مسئلہ حل ہونے کے بعد وہ آزاد تھی۔ جو چاہتی' کرتی۔

اس نے سوچا کہ معاملے کو تیزی سے نمٹانے میں عافیت ہے۔ رضوان کی قربت اسے الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ رضوان کی خاموشی میں اس کی توانائی تھی۔ اس کی گہری اُداسی نیلما پر اثر انداز ہوتی۔ اس کے اندر ایک تڑپ' ایک آرزو جگاتی' جس سے نہ تو

انکار کیا جا سکتا تھا' نہ اس کی تشفی ممکن تھی۔ لہٰذا جلد از جلد رضوان سے دور ہو جانے ہی میں بہتری نظر آتی تھی۔

ماجی خالہ بے حد سریت پسند تھیں اور سری ادب کی دلدادہ۔ انہوں نے اس کے کمرے میں دیواری شیلف کو سری ادب کے شہکاروں سے بھر دیا تھا۔ نیلما نے ابن صفی کا ایک ناول اٹھایا اور پڑھنے میں محو ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ 'اتنی جلدی نیند' اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس نے پلیٹ فارم کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جنگل بے حد تاریک' بے حد سیاہ دکھائی دیا۔ کھڑکی پر پردہ نہیں تھا اور یہ بات اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ وہ جہاں کی رہنے والی تھی' وہاں سونے سے پہلے مقفل دروازے اچھی طرح چیک کئے جاتے اور کھڑکیوں پر پردے کھینچے جاتے تھے۔ ماجی خالہ کا کہنا تھا کہ جنگل سے کوئی یہاں نہیں آسکتا۔ پہاڑ کے سامنے والے حصے پر کوئی پگڈنڈی بھی نہیں تھی۔

لیکن نیلما کو ایسا محسوس ہو رہا تھا' جیسے وہ روشنیوں میں نہائے ہوئے کسی اسٹیج پر موجود ہے۔ صرف یہی نہیں' اسے یہ احساس بھی تھا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔

وہ تبدیل کرنے کے لیے لباس نکالنے کی غرض سے الماری کی طرف بڑھی۔ اسی لمحے اسے ایسی آواز سنائی دی' جیسے کسی نے پلیٹ فارم پر مٹھی بھر کنکر پھینکے ہوں۔ وہ چوکنا ہو گئی اور اس نے بڑھ کر وہ سوئچ دبا دیا' جس سے پلیٹ فارم پر روشنی ہوتی تھی۔ پھر اس نے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا لیکن وہاں کسی قسم کا کوئی تحرک نہیں تھا۔ اس نے سلائیڈنگ ڈور کو غیر مقفل کیا اور بے حد محتاط انداز میں پلیٹ فارم پر قدم رکھنے کے بعد گردوپیش کا جائزہ لیا۔

پہاڑ جس جگہ زمین سے ملتا تھا' وہاں سفید چمک سی دکھائی دی۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا' جیسے وہاں کوئی رینگنے کے سے انداز میں جھک کر بیٹھا ہے لیکن جب تا دیر اس سفید چمک دار دھبے نے حرکت نہ کی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی جھاڑی میں الجھا ہوا کوئی کپڑا ہے۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ مگر وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ پہلے وہ کپڑا اس جگہ موجود نہیں تھا۔ پھر پلیٹ فارم کے فرش پر کنکر نظر آئے۔ اسے یاد آیا کہ کنکر گرنے کی آواز ہی نے اسے چونکایا تھا۔ یعنی کوئی کنکروں کے ذریعے اسے اس طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جھاڑی میں وہ کپڑا بھی اسی شخص نے اٹکایا ہو گا۔

"کون ہے؟ کوئی ہے یہاں؟" اس نے زور سے پکارا حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس کا

کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ وہ پلیٹ فارم پر آگے بڑھی۔ مکان کے سامنے والے حصے سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گویا ماجی خالہ تنہا نہیں تھیں۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بہ وقت ضرورت اسے صرف ایک بار چیخنا تھا۔ مدد فوراً آجاتی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس سفید کپڑے کو دیکھا جائے۔ ممکن ہے' اسے چھو کر اس کی مدد سے کچھ معلوم کیا جا سکے اور اس سفید کپڑے کو تنہائی میں چھونا زیادہ بہتر تھا۔

وہ ریلنگ پھلانگ کر نیچے اتری۔ وہ جھاڑی بہ مشکل پانچ قدم دور تھی' جس پر کپڑا اٹکا ہوا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اسے بہت دور سمجھتی تھی۔ وہ جھاڑی کی طرف بڑھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کپڑے کو چھوا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے پوری قوت سے اُسے دھکا دیا۔ اسے اندھیرے خلا میں لڑھکنے' درختوں کے قریب سے گزر کر نیچے کی سمت جانے کا احساس ہوا۔ پھر اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرائی اور ساکت ہو گئی۔ اردگرد تیرتی ہوئی تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ہوش میں تھی لیکن ہلنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر اس حالت میں رہی ہے۔ سردی اس کی ہڈیوں میں اتری جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے حواس یکجا کر کے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ بیٹھنے کے بعد اس نے نظر اٹھا کر ماجی خالہ کے مکان کو دیکھا۔ روشن پلیٹ فارم پہلے کی طرح اب بھی خالی تھا۔ بالائی منزل کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اس نے کمزور آواز میں ماجی خالہ کو پکارا مگر بے سود۔ گویا اسے وہاں سے اپنے طور پر جلد از جلد نکلنا تھا۔ اسے خوف تھا کہ حملہ آور واپس نہ آجائے۔ اب اس نے جائزہ بھی لیا۔ وہ جھاڑی سے زیادہ نیچے نہیں گری تھی۔ اس نے نیچے دیکھا اور لرز کر رہ گئی۔ اگر وہ جھاڑی سے الجھ کر نہ رک گئی ہوتی تو سینکڑوں فٹ نیچے گرتی اور اس کی ہڈیاں بھی سرمہ بن گئی ہوتیں۔

خاصی کوشش کے بعد وہ اوپر چڑھی۔ اوپر پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر حملہ آور شاید جا چکا تھا۔ اس نے جھاڑی سے کپڑا نکالا اور پلیٹ فارم پر چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اس سفید کپڑے کا جائزہ لیا' جسے کسی نے اسے شکار کرنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

ایک نظر میں ہی اسے اندازہ ہو گیا۔ وہ بانو کا وہی لبادہ تھا' جس میں گمشدگی کے بعد اسے عمران اور وقار نے جنگل کے کنارے دیکھا تھا۔ اس نے لبادے کو ہاتھ میں لیا اور

ایک دم ساکت ہو گئی۔ دہشت کی وہی لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی جس سے وہ بانو کا دوپٹہ چھونے کے بعد پہلی بار آشنا ہوئی تھی' اس میں دھند میں لپٹی ہوئی اس دھنک کا کوئی تاثر نہیں تھا' جو بانو کی شخصیت نے اس کے ذہن پر چھوڑا تھا۔ اس لمس کا تاثر تو شیطانی تھا۔ وہ تو قاتل تاثر تھا۔

اس نے لبادے کو کندھے پر ڈالا اور باہر نکل کر سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ اوپر سے آنے والی آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر وہ ٹھٹکی۔ وہ پہلے اندر کا منظر خاموشی سے دیکھنا چاہتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے قتل کرنے کی کوشش کرنے والا کمرے میں ہی موجود ہو۔

کھانے کی میز کے گرد وقار' جاوید' رضوان اور شہناز بیٹھے تھے۔ پھر اسے ایک طرف کلثوم بھی نظر آئی۔ صرف عمران کی کمی تھی۔ نیلما سوچتی رہی۔ ممکن ہے' ان میں سے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو لیکن کس نے؟ کسے اتنی مہلت ملی ہو گی کہ دھکا دینے کے بعد یہاں آجائے۔

وہ سب کے سب اسے گھور رہے تھے۔ پھر نیلما کے ذہن میں ایک خیال کا جھماکا ہوا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بولتا یا آگے بڑھتا' اس نے کندھے پر پڑا ہوا لبادہ آگے کر دیا۔

"یہ بانو کا لبادہ ہے.......ہے نا؟"

اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔"لیکن اسے پہنا کسی اور نے ہے۔" اس نے کوشش کر کے خود پر قابو پا لیا تھا۔

رضوان نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے لبادہ لیا اور اسے چند لمحے بغور دیکھنے کے بعد کرسی کی پشت گاہ پر لٹکا دیا۔ اس کے انداز میں عجیب سی قطعیت تھی' جیسے اس نے تسلیم کر لیا ہو کہ بانو مر چکی ہے۔ البتہ اس کی آنکھوں میں نیلما کے لیے فکرمندی تھی۔

"کیا بات ہے۔ آپ کو کیا ہوا؟ آپ زخمی ہیں!" رضوان نے پُرتشویش لہجے میں نیلما سے پوچھا۔

نیلما کو اچانک ہی اپنی حالت کا احساس ہوا۔ اس کی پیشانی پر خراش تھی۔ قمیص کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ جوتوں میں سرخ مٹی لگی تھی۔ پھر اس نے اپنا دھیان اپنی حالت سے ہٹایا' پورا واقعہ سنایا اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ ہر شخص کا ردعمل بغور دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر وقار کے سوا وہ سب اس کی طرف سے پریشان معلوم ہوتے

تھے۔ یہ بات وہ پہلے ہی سمجھ چکی تھی کہ وقار کے محسوسات کو سمجھنا آسان نہیں۔

ماجی خالہ پریشان بھی تھیں اور برہم بھی۔ ”چلو نیلی‘ میں تمہارا زخم دھو کر دوا لگا دوں۔ ارے......... کندھے پر بھی چوٹ لگی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”نہیں خالہ......... ابھی اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ ”میری مدد کرو......... مجھے بتاؤ‘ ان میں سے میرا دشمن کون ہے۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے دماغ سے سرگوشیانہ استدعا کرتی رہی۔ ”میں اب نہ منہ چھپاؤں گی‘ نہ بھاگوں گی۔ میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔“ اس نے بہ آواز بلند کہا۔

ماجی خالہ لال دوا لے آئیں اور لرزتے ہاتھوں سے اس کی خراشوں پر لگانے لگیں۔ ان کی پریشانی ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ اتنی آسانی سے کبھی پریشان نہیں ہوتی تھیں۔

رضوان نے نیلما کے لئے کرسی لا کر رکھ دی۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر خود بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ نیلما اس لمحے اُس کے لئے اپنے دل میں جذبہ تشکر محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک بار پھر اس نے سب کے چہروں کو بغور دیکھا۔ اس کی اعصابی کشیدگی لَوٹ آئی۔ کلثوم کے چہرے پر برہمی تھی۔ جاوید اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ شہناز نروس تھی۔ رضوان بے حد محتاط اور سب کی جانب نگراں تھا۔

پھر خاموشی کو رضوان ہی نے توڑا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ ہے نیلما کہ آپ کتنی دیر بے ہوش رہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“

”ہم میں سے کسی کو بھی یہاں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ رضوان نے کہا۔

اس کے لہجے سے اس کے اس یقین کا اندازہ ہوتا تھا کہ نیلما کو دھکا دینے والا کمرے میں موجود لوگوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے اور جھاڑی پر لبادے کی موجودگی ثابت کرتی تھی کہ حملہ آور نے سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے۔

”خچر دن بھر شور مچاتے رہے ہیں......... اب بھی مچا رہے ہیں‘ جیسے کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی محسوس کر رہے ہوں۔“ کلثوم نے کہا۔ ”اور خچر بہت حساس ہوتے ہیں اس معاملے میں۔“

”خچر؟ فضول بات ہے۔“ جاوید نے اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”خیر......... اصل سوال یہ ہے کہ نیلما صاحبہ کو کس نے دھکا دیا۔“

”وہ تم بھی ہو سکتے ہو۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“ نیلما نے سوچا۔

”یہ لبادہ بہت اہم ہے۔“ ماجی خالہ بولیں۔ ”کسی نے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس لبادے کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے تو سود مند ہو گی۔“

”یہ لبادہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اسی لئے کئی ماہ پہلے بانو نے یہ لبادہ مجھے دے دیا تھا۔“ شہناز نے کہا۔ ”بانو کے غائب ہونے کے بعد میرا کبھی اسے پہننے کو جی نہیں چاہا۔ میں نے اسے الماری میں ڈال دیا اور میرے خیال میں اسے اب بھی الماری ہی میں ہونا چاہئے تھا۔“

”اور میں نے جنگل میں جو ہیولا دیکھا‘ وہ یہی لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بہت ڈھیلا ڈھالا ہے۔ لہٰذا اسے کوئی بھی پہن سکتا ہے......... کوئی مرد بھی۔“ وقار نے بتایا۔

”یعنی اس میں تم بھی سما سکتے ہو۔“ جاوید نے اس پر طنز کیا۔

”فضول باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“ ماجی خالہ نے مداخلت کی۔

وقار اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیا۔ ”مجھ سے کوئی مدد درکار ہو تو بلا تکلف کہہ دیجئے گا۔“ اس نے دروازے پر پلٹ کر ماجی خالہ سے کہا۔

”ایک منٹ......... وقار!“ جاوید نے اُسے پکارا۔ ”تم سب سے آخر میں آئے تھے۔ ایسے میں کیا یہ ممکن نہیں کہ.........“

وقار پلٹا اور جاوید کے قریب آ کر اُسے گھورنے لگا۔ ”اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟“ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

جاوید کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔ وقار چند لمحے اسے گھورنے کے بعد پلٹا اور باہر چلا گیا۔

”یہ شخص کسی دن کچھ کر کے رہے گا۔“ اس کے جانے کے بعد شہناز نے کہا۔

”بلکہ کیا پتا‘ کچھ کر چکا ہو۔“ وہ کرسی پر لٹکے لبادے کی طرف بڑھی مگر نیلما نے اسے روک دیا۔

”پلیز! فی الوقت اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اس پر مزید لمس مرتب ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اسے یہیں رہنے دو۔“ ماجی خالہ نے کہا۔ ”اب.........“ اسی وقت

فون کی گھنٹی بجی۔ ماجی خالہ نے ریسیور اٹھایا اور چند لمحے سننے کے بعد ریسیور نیلما کی طرف بڑھا دیا۔ "تمہاری مما کا فون ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہیلو مما۔" نیلما نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیسی ہو بیٹا۔" مما کی محبت بھری آواز اُبھری۔ "نیلی بیٹا شام نگر میں کوئی سنگین واقعہ ہوا نا؟ میں شام سے پریشان ہوں۔ ایک خیال رہ رہ کر تنگ کر رہا ہے مجھے۔ تم خیریت سے تو ہو؟"

جی مما.......... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"سونے سے پہلے آیتہ الکرسی کا حصار کرنا نہ بھولنا۔ اللہ کے کلام کی حفاظت میں رہے تو انسان ہر آفت سے بچا رہتا ہے۔ تم پر کبھی کوئی آفت نہیں آئے گی۔ جو کچھ ہو گا' اچھا ہی ہو گا۔ یہ بات جانتی ہو نا؟"

"جی مما۔ ابھی کچھ دیر پہلے خالہ کے گھر کے باہر کسی نے مجھے دھکا دیا تھا۔ میں ایک جھاڑی میں الجھنے کی وجہ سے گرنے سے بچ گئی اور سب خیریت ہے مما۔"

"تمہیں کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تم محفوظ ہو۔" مما کے لہجے میں یقین تھا۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولیں۔ "چھت پر کام کرنے والے سے مدد لو۔ اس کے پاس ایک قوت ہے جو تمہاری مدد کر سکتی ہے۔ جلد از جلد ملو اس سے۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ نیلما چند لمحے ریسیور ہاتھ میں لئے ساکت بیٹھی رہی۔ ماں کے نغمگیں' محبت آمیز لہجے نے اُسے بھرپور سہارا دیا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے محفوظ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا' صبح پہلی فرصت میں وقار سے ملوں گی۔

☆======☆======☆

صبح وہ ناشتے سے بھی پہلے بہانہ بنا کر گھر سے نکل آئی۔ وہ پیدل ہی وقار کے کیبن کی طرف چل دی۔ اس نے کیبن کے دروازے پر دستک دی لیکن دروازہ ہاتھ لگتے ہی کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ وقار کمرے میں موجود تھا۔ نیلما نے کمرے کا جائزہ لیا اور وقار کو سلام کرتے ہوئے بولی۔ "واہ' آپ کا گھر تو بہت خوبصورت ہے۔"

وقار کی مسکراہٹ میں شکریہ پنہاں تھا۔

بستر کے برابر ہی ایک میز تھی۔ وقار نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم شاید ان کی تلاش میں آئی ہو۔"

نیلما نے میز کی طرف دیکھا میز پر کچھ رَف سکیچ بکھرے ہوئے تھے۔ نیلما کو ایک نظر

میں اندازہ ہو گیا کہ وہ ستارہ جاوید کی جانوروں کی کہانیوں والی کتاب کے رَف اسکیچ ہیں' جو ستارہ نے ماجی خالہ کو آئیڈیا دینے کے لئے بنائے ہوں گے۔

وقار نے میز کے نیچے سے اس کے لئے کرسی کھینچ دی۔ نیلما نے بیٹھتے ہی سب سے اوپر والے اسکیچ کو دیکھا۔ یہ تو نظر آ گیا تھا کہ تمام اسکیچ انسانی خدوخال میں ہیں۔ اگرچہ انہیں خچر دکھایا گیا ہے۔

پہلا اسکیچ ستارہ کا اپنا تھا' جو کہانی کی ہیروئن تھی۔ دوسرے اسکیچ میں محبت کی ماری ایک مخلوق تھی' جو راہ میں آنے والی ہر ہستی سے پیار کرنے کی خواہاں معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا اسکیچ جس انسانی خچر کا تھا' وہ یقینی طور پر جاوید تھا۔ وہ جنگلے کے قریب لگا کھڑا تھا۔ جنگلے کے دوسری طرف ستارہ خچر کے روپ میں اپنی لانبی گردن بڑھا کر اس کا رخسار چوم رہی تھی۔ انداز محبت آمیز تھا۔ دوسری طرف جاوید کا چہرہ ناخوش ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔

نیلما کچھ بے چین ہو گئی۔ اسکیچز میں عجیب سے سنگینی تھی۔ حالانکہ بظاہر وہ بچکانہ مذاق معلوم ہوتا تھا۔ مگر درحقیقت وہ مضحکہ اُڑا رہی تھی۔ شاید سب سے پہلے اپنا۔

بانو نما خچر پہلی ہی نظر میں پہچان لیا گیا۔ اس اسکیچ میں بھی سنگینی تھی۔ پس منظر میں محبت کا بھوکا' مگر محبت دینے والا ایک بچہ تھا۔ وہ عمران تھا۔ بچے کے عقب میں ایک بلی کھلنڈرے پن سے اُچھل رہی تھی۔

اسکیچز کے ساتھ کہانی کے حصے موجود نہیں تھے۔ ممکن ہے' ستارہ نے بعد میں لکھنے کا پروگرام بنایا ہو لیکن نیلما کو یقین نہیں تھا کہ ستارہ سچ مچ وہ کہانیاں لکھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

وہ اسکیچز دیکھتی اور الٹتی رہی۔ پھر ایک مرد خچر کا اسکیچ نظر آیا۔ وہ جنگلے کے باہر کھڑا باڑے کے اندر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ رضوان تھا۔ جاوید نما خچر رعونت بھرے انداز میں اسے دور ہو جانے کا حکم دے رہا تھا وہ اس کی وہاں موجودگی پر برہم نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کے نزدیک رضوان نما خچر کی وجہ سے باداؤں کی عافیت مشکوک ہو گئی تھی۔

اگلا اسکیچ شہناز نما خچر کا تھا۔ وہ پرستش کرنے والی نگاہوں سے جاوید کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بے حد ظالمانہ اسکیچ تھا۔ نیلما اُس دوستی کی نوعیت پر غور کرنے پر مجبور ہو گئی' جو شہناز اور ستارہ کے درمیان رہی ہو گی۔ اس کے باوجود کہ دونوں ہی جاوید سے محبت کرتی تھیں۔

نیلما نے وہ اسکیچ وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بچّوں کی کہانیوں کی کتاب تو نہیں معلوم ہوتی۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ کبھی شائع بھی نہیں ہوئی۔ خیر .... اور دیکھو۔“

اب تین اسکیچ باقی رہ گئے تھے۔ ایک بار پھر شہناز کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ نگاہیں جاوید سے بھیک مانگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اگلا اسکیچ ایک ایسے انسانی خچر کا تھا جو محض تماشائی تھا۔ نیلما نے وہ اسکیچ بھی وقار کو دکھایا۔ ”یہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا‘ ستارہ کے نزدیک آپ اس میں شامل نہیں تھے بلکہ محض تماشائی تھے۔“ اس نے تبصرہ کیا۔

”اس کا اندازہ درست تھا۔ اگر میں بھی کھیل میں شامل ہو جاتا تو.........“ وقار نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

آخری اسکیچ بانو نما خچر کا تھا۔ درحقیقت اس کی ڈرائنگ سب سے اچھی تھی۔ بانو خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ قریب کھڑا بچے نما خچر سہما سہما‘ اسے دیکھ کر رو رہا تھا۔

نیلما نے تمام اسکیچ ایک طرف رکھ دیئے۔ ”ستارہ ان سب سے کیا ثابت کرنا چاہتی تھی؟“ اس نے وقار سے پوچھا۔

”ایسا کرو‘ کچھ دیر ان اسکیچز پر ہاتھ رکھ کے بیٹھو اور دیکھو‘ یہ تمہیں کیا بتاتے ہیں۔ اتنی دیر میں مَیں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں۔“ وقار نے مشورہ دیا۔

نیلما کچھ دیر سوچتی رہی۔ وہ ان اسکیچز کو پرے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ وقار کچن کی طرف چلا گیا اور اب وہ تنہا تھی۔ بالآخر اس نے ہچکچاہٹ کے باوجود وقار کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور اسکیچز پر رکھ دیئے۔

اس بار نہ کوئی دُھند تھی‘ نہ کوئی منظر۔ اب وہ نیلما ظفر بھی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی اور وجود‘ کسی اور دماغ میں داخل ہو گئی ہے۔ اس کی سوچوں پر الجھن‘ خوف اور اُداسی کا راج تھا۔ ایک خوف ناک احساس بھی تھا کہ اسے کسی سے مزاحمت کرنا‘ لڑنا ہے۔ خطرہ بہت نزدیک تھا لیکن اسے نہ خطرے کی نوعیت کا ادراک تھا‘ نہ یہ جانتی تھی کہ کیسی مزاحمت کرنا ہے۔ یہ خیال ذہن میں مسلسل چُبھ رہا تھا کہ اسے اس زنداں سے فرار ہو جانا چاہئے لیکن بھاگنے کا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی شے......... کوئی

شخص .... جو توانا بھی تھا اور سفاک بھی‘ فرار کی راہ میں مزاحم تھا۔ وہ ایسے کمرے میں تھی‘ جس کے مقفل دروازے کی چابی اس کے پاس نہیں تھی۔

اپنی اذیت میں ڈوبی چیخ اس کے ذہن میں ہی گھٹ کر رہ گئی......... مدد......... میری مدد کرو۔

لیکن نہیں۔ شاید وہ عملاً چیخی تھی۔ کیونکہ کچن کی طرف سے وقار بھاگتا ہوا آیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ”کیا بات ہے نیلما بی بی؟ تم یہاں ہو۔ میرے کیبن میں۔ یہاں کوئی تمہیں چُھو نہیں سکتا۔ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ اس کے لہجے میں شفقت تھی۔

نیلما نے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ ”ستارہ خوف زدہ تھی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ جانتی تھی کہ کوئی اسے قتل کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں اس وقت ستارہ کے جسم میں تھی اور مدد کے لئے چیخ رہی تھی۔“

”تمہیں یہ اشارہ نہیں ملا کہ ستارہ کو خطرہ کس کی طرف سے تھا؟“ وقار نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”بس‘ تو اب پُرسکون ہو جاؤ۔ میں تمہارے لئے چائے لاتا ہوں۔“

چائے بہت خوش ذائقہ تھی۔ نیلما پُرسکون ہونے لگی تھی کہ ایک خیال نے اسے پھر ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ بُری طرح لرزے اور چائے چھلک گئی۔ ”اوہ......... اف .... میں کچھ دیر پہلے جس قالب میں تھی‘ وہ ستارہ کا نہیں تھا۔“ اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”وہ.........تو بانو تھی۔“

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ”آجاؤ۔“ وقار نے پکارا۔ دروازہ کھلا اور شہناز اندر آئی۔ ”تم نے جاوید کو تو نہیں دیکھا؟“ اس نے وقار سے پوچھا۔ ”میں اس کے گھر گئی تھی۔ مگر مسلسل گھنٹی کی آواز بھی اسے نہ جگا سکی۔ اس کی کار البتہ باہر کھڑی ہے۔“

”میں نے جاوید کو نہیں دیکھا۔“ وقار کے لہجے میں بیزاری تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ شہناز کو ناپسند کرتا ہے۔ اسے شہناز کی مداخلت بھی پسند نہیں آئی تھی۔

شہناز اتنی پریشان تھی کہ اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ”وقار......... میرے ساتھ جاوید کے گھر چلو۔“ اس نے کہا۔ ”ہمیں اندر جا کر دیکھنا چاہیے کہ وہ خیریت سے ہے اور میں اکیلی جا نہیں سکتی۔“

”نہیں بی بی۔ میں جانتا ہوں کہ جاوید کو میری مداخلت ناپسند ہو گی اور میں تمہیں

بھی مداخلت سے باز رہنے کا مشورہ دوں گا۔ جاوید کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"دیکھو وقار.......... میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جاوید کسی پریشانی میں ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پریشانی اسے اچھی لگتی ہو۔" وقار نے بے رخی سے کہا۔ "وہ اس طرح کی ہمدردانہ مداخلت پر شکریہ ادا کرنے میں سے نہیں ہے۔"

"تم جانتے ہو۔ یقیناً جانتے ہو۔ ہے نا؟ تم اس کے گھر کے قریب ہی رہتے ہو۔ تم نے کچھ نہ کچھ دیکھا ہے۔" شہناز نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"شہناز.......... آپ کی پریشانی کا تعلق کسی طور ستارہ کی موت سے تو نہیں؟" نیلما نے پوچھا۔

"تم خود ہی بتا دو۔ میں نے سنا ہے کہ تم بغیر پوچھے بھی بہت کچھ جان لیتی ہو۔" شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ بات اتنی آسان نہیں، جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔" نیلما نے بے حد رسان سے کہا۔

شہناز بڑی بے تابی سے اپنی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ پھر اس نے کسی جیب سے چھوٹا سا لائٹر نکالا اور نیلما کی طرف بڑھا دیا۔ "پچھلی بار جاوید مجھ سے ملنے آیا تھا تو یہ میرے گھر ہی بھول گیا تھا۔ اسے چھو کر دیکھو.........."

شہناز نے وہ لائٹر نیلما پر تھوپ دیا تھا۔ نیلما نے جیسے ہی اسے مٹھی میں بھینچا، اس کی کنپٹیوں میں دھمک سی ہونے لگی۔ متلی کا احساس اس پر مستزاد تھا۔ اسے پانی میں کسی بے جان جسم کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ موت.......... قتل؟ لائٹر اس کی انگلیوں کو یوں جلا رہا تھا، جیسے کوئی انگارا ہو۔ اس نے مٹھی کھول کر لائٹر کو نیچے گرا دیا۔ اس کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بری طرح کانپنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ کیا دیکھا تم نے؟" شہناز چلائی۔

نیلما سے کچھ بولا نہ گیا۔ وقار اس کے برابر آ بیٹھا۔ "تم پہلے خود کو سنبھالو۔ پھر ہمیں بتانا کہ تم نے کیا دیکھا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

بہ دقت تمام نیلما نے خود پر قابو پایا اور بولی۔ "میں نے پانی میں بے جان جسم محسوس کیا ہے لیکن میں واضح طور پر نہیں دیکھ سکی۔ کہ وہ جاوید تھا یا کوئی اور۔ مجھے صرف موت کی نہیں، تشددانہ موت کی بو محسوس ہوئی تھی۔"

"کہاں؟ کس جگہ؟" شہناز نے ہذیانی لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے، میں کچھ کوشش کے بعد اس جگہ کو تلاش کر سکتی ہوں۔" نیلما نے اپنے خوف سے لڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" وقار نے کہا۔

نیلما اور وقار کیبن سے نکل آئے۔ متوحش اور پریشان شہناز ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ نیلما ایک پہاڑی راستے پر بڑھ رہی تھی۔ اس کی انجانی حس اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ راستہ چڑھائی کا تھا۔ چڑھائی چڑھنے کے بعد اس نے ایک سطح مسطح قطعۂ زمین پر قدم رکھا۔ سامنے ہی جاوید کا مکان تھا۔

"یہاں تو کہیں پانی نہیں ہے۔ نہ کوئی چشمہ نہ تالاب۔" شہناز نے چیخ کر کہا۔

نیلما چوکنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ انجانی حس چیخ چیخ کر کچھ بتا رہی تھی۔ وہ مکان کی طرف بڑھ گئی، جس پر موت کا سا سناٹا مسلط تھا۔

"تم نے پانی کہا تھا۔" شہناز نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"تم خاموش رہو۔ نیلما کو اپنا کام کرنے دو۔" وقار نے اسے ڈانٹ دیا۔

نیلما نے دروازے کا لٹو گھمایا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا، وہ اندر داخل ہو گئی۔ راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ بھی غیر مقفل تھا۔ سامنے ہی باتھ روم کا کھلا ہوا دروازہ تھا۔ نیلما کی سمجھ میں فوراً آ گیا کہ اس نے پانی کیوں دیکھا تھا۔

"وہاں۔" اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وقار باتھ روم کی طرف بڑھا اور دروازے میں اس طرح جم کر کھڑا ہو گیا کہ اندر کا منظر ان دونوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ "تم دونوں اندر نہ ہی آؤ تو بہتر ہے۔" اس نے کہا لیکن اس کی بات نہ نیلما نے سنی، نہ شہناز نے۔ انھوں نے اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

موت نے جاوید کے خدوخال مسخ کر دیے تھے۔ اس کی خوب رُوئی زندگی کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ ٹب میں اس کی لاش تیر رہی تھی۔ صابن کی ایک بٹی بھی ٹب میں پڑی گھل رہی تھی۔ جاوید کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

لاش سے زیادہ خوف ناک بات یہ تھی کہ ٹب میں صرف جاوید کی لاش نہیں تھی، ایک مُردہ سانپ بھی سطح آب پر موجود تھا!!

شہناز نے ٹب کی طرف لپکنا چاہا مگر وقار نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"اب تم جاوید کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ جو کچھ کرنا ہے' پولیس ہی کرے گی۔"

☆=====☆=====☆

پولیس کو جاوید کی موت کا معما حل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کی موت کا سبب سانپ نہیں' دل کا دورہ تھا۔ امکان یہ تھا کہ سانپ کو پانی میں موجود پا کر وہ خوف زدہ ہوا ہو گا اور حرکت قلب بند ہو گئی ہو گی۔ سانپ کا پایا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ علاقے میں سانپ بکثرت پائے جاتے تھے اور ٹب میں ملنے والا سانپ زہریلا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی موت کو حادثاتی قرار دے کر کیس داخل دفتر کر دیا گیا۔

لیکن نیلما کو یقین تھا کہ بات اتنی سادہ نہیں۔ لائٹر کو ہاتھ میں لیتے ہی اُسے متشددانہ موت' قتل کا احساس ہوا تھا اور ایسا بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ اسے یقین تھا کہ سانپ کسی نے لا کر باتھ روم میں چھوڑا ہو گا۔

جاوید کی موت کے چند روز بعد رضوان نے ماجی خالہ کے گھر فون کیا۔ "میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے نیلما سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گی۔"

"دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ کہیں تو ماجدہ باجی سے اجازت لے لوں؟"

"وہ میں لے لوں گی۔"

نیلما نے ہامی تو بھر لی تھی۔ مگر اب یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ خوش ہو یا اس ملاقات کے تصور سے خوف زدہ۔

رضوان اُسے لینے کے لئے آیا تو بے حد بجھا بجھا تھا۔ جاوید کی موت کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ نیلما اس سے جاوید کی موت کے متعلق گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ جیپ میں سفر کے دوران وہ خاموش رہا اور نیلما مضطرب۔ جیپ اس کے مکان سے آگے نکلی تو نیلما نے استفسار کیا۔ "دراصل یہاں ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے۔" رضوان نے وضاحت کی۔ "میں نہیں چاہتا کہ ہماری گفتگو میں عمران بھی شریک ہو۔ اسی لئے ہم کھانا ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔ وہیں گفتگو بھی ہو گی۔"

ریسٹورنٹ واقعی بہت اچھا تھا۔ سروس بھی اچھی تھی اور کھانا بھی۔ کھانے کے بعد رضوان نے بات شروع کی۔ "باجی نے مجھے بتایا کہ آپ نے جاوید کی لاش کیسے دریافت کی۔ مگر میں ذرا تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں۔"

نیلما اس سلسلے میں خود بھی بات کرنا چاہتی تھی لیکن اب نہ جانے کیوں اس کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ "کیا بتاؤں؟ آپ کہہ رہے ہیں کہ خالہ آپ کو سب کچھ بتا چکی ہیں۔"

"میں پورا عمل سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کیا محسوس کیا؟ جو کچھ آپ کو نظر آیا' کس طرح نظر آیا؟"

پھر نیلما بتاتی رہی اور وہ بغور سنتا رہا۔ نیلما اس دوران یہ بھی سوچتی رہی کہ کاش' وہ رضوان اور عمران کے لئے بھی کچھ کر سکتی۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ کی رہنمائی بانو کی کسی چیز نے بانو تک کیوں نہیں کی؟" رضوان نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

نیلما نے نفی میں سر ہلایا اور بے حد ناخوش نظر آنے لگی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا مگر نیلما کو محسوس ہوتا تھا کہ ان کے درمیان سات سمندر حائل ہیں۔ "مجھے نہیں معلوم۔" بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن میں جب بھی آپ کی بیوی پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتی ہوں' مجھے خوف آنے لگتا ہے' اختلاج ہونے لگتا ہے' مجھے سمتوں کا احساس ہی نہیں رہتا۔"

رضوان کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "میں سوچتا ہوں کہ مجھے خود کوشش کرنی چاہئے۔ وقار کا کہنا ہے کہ مجھ میں بھی گمشدہ چیزوں کو کھوجنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس سے استفادہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور پھر یہ سوال بھی ہے کہ مجھ میں یہ صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔"

"بعض اوقات مراقبے سے بڑی مدد ملتی ہے۔" نیلما نے کہا۔ "باہر کا سب کچھ بھول کر اپنے باطن میں اترنے' اُسے کھوجنے سے چھپے ہوئے خزانے مل جاتے ہیں۔ پھر تصور میں ہیولے.......... اور اس کے بعد واضح تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا ہے۔"

"یہ تو صرف لفظ ہیں۔ لفظوں سے میں کیا سمجھوں گا۔ ویسے میں ذہنی طور پر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"آپ کی بات سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مایوس ہیں اور مایوسی میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔"

رضوان نے کندھے جھٹک دیئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر نیلما نے بے خیالی میں اپنے آویزوں کو چھوا۔ وہ آویزے اُسے ممانی نے دیئے تھے۔

رضوان نے اس کی وہ حرکت بڑے غور سے دیکھی۔ "یہ فیروزہ ہے۔" رضوان نے کہا۔ "مجھے یاد ہے' میری امی کو فیروزہ پہننا بہت پسند تھا۔ ان کے بیشتر جڑاؤ زیورات فیروزے کے تھے۔ وہ کہتی تھیں' فیروزہ شیطنت کے خلاف آدمی کی بڑی مدد کرتا ہے' اسے تحفظ فراہم کرتا ہے۔"

ماجی خالہ نے نیلما کو بتایا تھا کہ رضوان کی والدہ بے حد مذہبی خاتون تھیں۔ بہرکیف رضوان کا اس طرح گفتگو کرنا نیلما کو بہت اچھا لگا۔ پہلی بار اسے اس کی قربت میں سکون کا احساس ہوا۔ کچھ یوں بھی کہ رضوان کبھی اپنے متعلق بات نہیں کرتا تھا۔ مگر آج اپنی ماں کے متعلق بات کر رہا تھا۔ یہ اعتماد کی نشانی تھی۔

"میں نے حال ہی میں ایک خواب دیکھا تھا۔ تمہارے خواب جیسا۔" کچھ توقف کے بعد رضوان نے کہا۔ اس بار اُس کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ "میں نے دیکھا' میں جنگل میں اس پہاڑی چھجے کی طرف جا رہا ہوں' جس پر سے گر کر ستارہ ہلاک ہوئی تھی۔ مجھے خواب میں یہ احساس بھی تھا کہ وہاں کوئی خوف ناک حادثہ رونما ہو رہا ہے' جو میری زندگی کی رہی سہی خوشیوں کو بھی تہہ و بالا کر دے گا۔ تم وہاں موجود تھیں۔ نہ جانے کیسے' تم بھی اس سیٹ اَپ میں شامل تھیں۔ تم کسی کے ساتھ تھیں۔ جس کے ساتھ تھیں' اُسے دیکھ کر مجھے بانو کا خیال آیا تھا۔ یا تو تم مرنے والی تھیں یا بانو۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں خوف زدہ کس بات سے تھا۔ تم اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتی ہو؟"

نیلما خاموشی سے اُسے دیکھتی رہی۔ وہ اس کے لفظوں سے ماورا ہو کر خود اُسے محسوس کر رہی تھی۔ پچھلے کئی روز سے وہ اُس سے نہیں ملی تھی۔ مگر اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کوئی آتا تو وہ اس توقع پر دیکھتی کہ شاید وہ ہو۔ وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستی رہی تھی اور اب جبکہ وہ اس کے ساتھ تھی تو اپنے جذبوں کو خود سے بھی چھپا رہی تھی' یہ سوچ کر کہ یک طرفہ جذبے دُکھوں کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ وہ اس انداز میں سوچتی رہے لیکن رضوان تو نہیں سوچ سکتا۔ اس کی زندگی میں تو ابھی بانو کا امکان ہے۔ اور اس سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے لئے پریشان ہے۔

"نہیں......... میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔" کچھ دیر بعد اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"یہی حال میرا بھی ہے۔ دیکھو......... یہاں دو...... اور ممکنہ طور پر تین اموات

ہو چکی ہیں جبکہ یہاں کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے۔ تم اس سلسلے میں کچھ محسوس نہیں کر سکتیں؟"

نیلما نے اس قدر بے ساختہ جواب دیا کہ خود بھی حیران رہ گئی۔ "میں محسوس کرتی ہوں کہ ستارہ جاوید پھسل کر گرنے سے نہیں مری بلکہ اسے کسی نے دھکا دیا تھا۔ بانو کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ بانو کے بارے میں جب بھی کچھ جاننا چاہا ہے' کسی شیطانی قوت کی موجودگی کا شدت سے احساس ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جاوید کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کے ٹب میں کسی نے سانپ اُچھالا تھا۔ بے شک اس کی موت کی وجہ خوف تھی لیکن خوف کی وجہ اتفاقی نہیں تھی۔" یہ سب کچھ کہتے کہتے وہ لرزنے لگی۔ رضوان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"مجھے افسوس ہے نیلم! میں نے بلاوجہ تمہیں اس شیطانی چکر میں ملوث کیا لیکن میں کیا کروں۔ مجھے کوئی راستہ بھی تو سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے پولیس تو دونوں اموات کو حادثاتی قرار دے چکی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی خطرناک شیطانی ہستی بہرحال موجود ہے۔"

نیلما نے بڑی ملائمت سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔ اگر اس کے ہاتھ چند لمحے اور رضوان کے ہاتھوں میں رہتے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ ویسے اسے وہ گرفت بہت اچھی......... بہت سحرانگیز لگی تھی۔ "آپ یہ مسئلہ خود حل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟" اس نے کہا۔

رضوان کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ "میں کیا کروں؟ کیا کر سکتا ہوں میں؟"

"اپنے آپ کو ٹٹولیں۔ آپ کو اپنی والدہ سے یقیناً کچھ ملا ہو گا۔ وقار نے اسی لئے تو آپ کو خود کچھ کرنے کا مشورہ دیا ہو گا' اور ایک بات بتا دوں' کسی پیدائشی صلاحیت کو دبانا کسی اعتبار سے سودمند ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے پوری طرح دبایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر ہم دونوں کوشش کریں تو یقیناً بانو تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیسے کرنا ہے۔"

"ایسا کرتے ہیں' پہلے وقار کے پاس چلتے ہیں۔ اُن کے پاس کچھ ایسی چیزیں ہیں' جو آپ کو دیکھنا چاہئیں۔"

☆======☆======☆

وہ باہر نکلے تو اندھیرا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا

بند تھی۔ قرائن بتاتے تھے کہ طوفانی بارش ہو گی۔ وقار کے کیبن تک پہنچتے پہنچتے دھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔

وقار اپنے کمرے میں آتش دان دہکا رہا تھا۔ اٹھتے گرتے شعلوں کی وجہ سے کمرے میں سائے پھرتے معلوم ہو رہے تھے۔ اسکیچز اس نے فرش پر پھیلا رکھے تھے۔ نیلما نے بانو کا اسکیچ دور ہی سے پہچان لیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" رضوان نے اسکیچز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نیلما نے وضاحت کی تو رضوان فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے اسکیچ دیکھے۔ بانو کا پہلا اسکیچ دیکھ کر اس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ اتر آئی۔ "ستارہ نے یہ اسکیچ بہت خوب بنایا ہے۔ بانو دیکھے گی تو محظوظ ہو گی۔ کبھی کبھی اسے اپنا مذاق اڑانے میں بھی لطف آتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ تم بانو کو جانتے بھی تھے اور جانتے تھے تو کتنا جانتے تھے۔" وقار بولا۔

بانو کا شوہر ہونے کی حیثیت سے رضوان سے کیا جانے والا وہ سوال نیلما کو نامناسب اور ناگوار لگا لیکن رضوان کے چہرے پر حیرت کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ "کبھی کبھی تو میں اسے بالکل ہی نہیں سمجھ پاتا تھا اور جب میں سمجھتا تھا کہ اب اس کے باطن تک پہنچنے والا ہوں تو اچانک احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گئی ہے۔" اس نے کہا۔

نیلما بھی فرش پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ بانو کے اسکیچ کو دوبارہ بغور دیکھنا چاہتی تھی۔ بانو کا دوسرا اسکیچ دیکھ کر رضوان کے چہرے پر اذیت کا تاثر ابھرا۔

"وقار بھائی' آپ کو جاوید کے متعلق کوئی بات معلوم ہو تو اب بتا دیجئے......... پلیز!" نیلما نے استدعا کی۔

وقار آتش دان کو گھورتا رہا۔ پھر وہ میز کی طرف گیا اور اس نے ایک اور ڈرائنگ اٹھائی۔ "نیلما......... میں نے پچھلی بار یہ اسکیچ تمہیں نہیں دکھایا تھا۔" اس نے کہا۔ "لیکن اب بہتر ہے کہ ایک نظر اسے دیکھ لو۔ ویسے میں رضوان کو یہ اسکیچ نہیں دکھانا چاہتا۔"

نیلما نے اسکیچ لے کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر بدمزگی کا تاثر ابھرا۔ ستارہ نے اس بار بھی بانو کو مرکز بنایا تھا۔ بانو نما خچر کلثوم کے باڑے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ ایک مرد نما خچر کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پایاں محبت تھی اور چہرے پر

پرستش کا تاثر۔ توقع کے مطابق مرد رضوان نہیں نستارہ کا شوہر جاوید تھا اور جاوید کے انداز میں نہ بے نیازی تھی نہ سرد مہری۔

نیلما نے وہ اسکیچ رضوان کو دکھایا' رضوان برہم ہو گیا۔ "یہ تو پاگل پن ہے۔" اس نے کہا۔ "بانو نے تو کبھی جاوید پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالی۔ بلکہ وہ تو اس سے متعلق ہر چیز کو سخت ناپسند کرتی تھی۔"

"اسکیچ کے پیچھے جو لکھا ہے' ذرا وہ بھی پڑھ لو۔" وقار بولا۔

نیلما نے اسکیچ پلٹ کر دیکھا۔ نچلے کنارے پر ستارہ نے مختصر سی عبارت لکھی تھی۔

"جاوید......... جاوید......... یہ کیسے کیا تم نے۔"

"یہ نری حماقت ہے۔" رضوان نے اسکیچ کھینچا اور اسے فرش پر پھینک دیا۔ نیلما کو ایک لمحے کو ایسا لگا' جیسے وہ پاؤں پٹختا ہوا کیبن سے نکل جائے گا۔

"آؤ......... یہاں بیٹھو۔" وقار نے رضوان کو پکارا۔ "میں نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہو لیکن اب سوچتا ہوں کہ علم ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ امکان موجود ہے کہ جاوید نے اسے قتل کیا ہو۔"

"کسے؟ بانو کو!" نیلما نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں' ستارہ کو۔ بانو کی خاطر۔ بانو اس کا جنون بن گئی تھی۔ ستارہ نے اس سلسلے میں خود مجھے سب کچھ بتایا تھا حالانکہ میں نہیں جاننا چاہتا تھا۔ جاوید دیکھنے میں کسی فلمی ہیرو کی طرح تھا لیکن ستارہ جانتی تھی کہ وہ عملاً بھی فلمی ہیرو ہی ہے' فلرٹ۔ اس کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی تھی اور محبت کے نام پر سب کچھ برداشت کر لیتی تھی لیکن جب اسے بانو کے متعلق پتا چلا تو بات اس کے ضبط سے سوا ہو گئی۔ دوسری طرف جاوید کے خیال میں اب ستارہ سے پیچھا چھڑانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ یقینی طور پر درست نہیں۔ میں اپنی معلومات کی روشنی میں محض اندازے قائم کر رہا ہوں۔ عشق کے نام پر ہوس کی خاطر یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔" رضوان نے سنگین لہجے میں کہا۔ "میں بانو کو اتنا ضرور جانتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اس قسم کے عشق یا ہوس کی اہلیت ہی نہیں تھی۔ اس کی تو اپنی ہی ایک دنیا تھی۔ اسے محبت تھی تو اپنی تصوراتی دنیا سے۔ یہاں تم غلطی پر ہو وقار۔"

"میں اس چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بانو کے غائب ہو جانے کے بعد مجھے تمہیں

یہ سب بتانا چاہیے تھا۔ مگر مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ میں نے غائب ہونے کے بعد کئی بار اسے جاوید کے گھر میں دیکھا بھی.........."

"لیکن آپ ہی نے مجھے بتایا کہ عمران نے جسے دیکھا ہے' وہ بانو ہرگز نہیں۔" نیلما نے اسے یاد دلایا۔

"یہی تو عجیب بات ہے!" وقار کے لہجے میں الجھن تھی۔ "میں نے اسے چلتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بانو نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ستارہ کی موت کے بعد جاوید کے ساتھ کوئی رہ رہا ہے لیکن میری اور جاوید کی ویسے ہی لگتی تھی۔ میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی میں نے کبھی گندگی کے اس کھیل میں حصہ نہیں لیا۔ میں خواہ مخواہ کسی کو بے نقاب کیوں کرتا۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ نہ ہی کوئی معقول جواز ہے۔" رضوان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "پورا شام نگر بانو کو ڈھونڈتا رہا اور تم جو حقیقت جانتے تھے' تماشا دیکھتے رہے۔ وقار! میں تمہارے اس طرز عمل کو درست تسلیم نہیں کر سکتا اور مجھے تمہاری بات پر یقین بھی نہیں۔ اب ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ جاوید کے گھر چلو۔ اگر تمہاری بات درست ہے تو وہاں سے بانو کی موجودگی کی کوئی نہ کوئی شہادت ضرور ملے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو تم تسلیم کر لینا کہ تمہارا اندازہ غلط تھا۔"

"چلو.......... ابھی چلتے ہیں۔"

وہ باہر نکلے۔ بارش ابھی دھواں دھار ہو رہی تھی۔ جاوید کا گھر زیادہ دور نہیں تھا لیکن پیدل چلنے کی صورت میں وہ شرابور ہو جاتے۔ چنانچہ انہوں نے جیپ میں جانا مناسب سمجھا۔ سڑک کے ذریعے گھوم کر جانا پڑا۔

جاوید کے مکان میں اندھیرا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے غیر آباد ہونے کا تاثر ذہن میں ابھرتا تھا۔

وقار نے دروازہ کھولا اور لائٹ آن کی۔ نیلما کو اس مکان میں اپنا پہلا داخلہ یاد آیا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"وقت کی بچت کے لیے ہم لوگ الگ الگ راستے پکڑ لیں تو بہتر ہے۔" رضوان نے تجویز پیش کی۔ "ہمیں مکان میں موجود ہر خلاف معمول چیز پر توجہ دینا پڑے گی۔ ہر ایسی چیز' جس سے مکان میں جاوید کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کا اندازہ ہو۔"

نیلما اوپری منزل پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ کچن کے قریب قریب رہی۔ پچھلی

بار کے مقابلے میں اسے صرف ایک تبدیلی نظر آئی۔ کچن میں چولہے کے قریب ایک آلو رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی چاقو بھی تھا۔ پچھلی بار جب اس نے جاوید کی لاش دریافت کی تھی تو اس وقت کچن میں ہر چیز اپنی جگہ ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ آلو کو کاٹ کر دو ٹکڑے کیے گئے تھے۔ ٹکڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصے عرصے سے یونہی رکھے ہیں۔ ان کے اندرونی حصے سیاہ پڑ چکے تھے۔ چولہے پر رکھی کیتلی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے حال ہی میں کچن کو استعمال کیا ہے۔

نچلی منزل کے کسی حصے سے رضوان نے پکارا۔ "نیلم' ایک منٹ کے لیے یہاں آؤ۔"

نیلما آواز کی ڈور تھامے تھامے بڑھی اور لائبریری کے دروازے تک جا پہنچی۔ لائبریری میں بے ترتیبی تھی مگر وہ غیر فطری نہیں لگتی تھی۔ جو لوگ کتابوں سے متعلق کام کرتے ہوں' مصروف رہتے ہوں' ان کی لائبریریاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ نیلما کو یاد آیا' کسی نے بتایا تھا کہ جاوید کوئی کتاب تصنیف کر رہا تھا۔

"نیلم.......... ذرا اِدھر اُدھر ایک نظر۔" رضوان نے ایک شیلف کی طرف اشارہ کیا' جس پر ضخیم کتابیں رکھی تھیں۔ "یہ پُراسرار اور مخفی علوم پر کتابوں کا سیکشن ہے۔ اس میں پیرا سائیکالوجی کی کتب بھی ہیں۔ ہے نا عجیب بات۔ ایک ایسے شخص کی لائبریری میں ان موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کی موجودگی' جن کی وہ زندگی بھر سختی سے مخالفت کرتا رہا ہو۔"

"یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔" نیلما نے کہا۔ "کیا پتا' وہ ان کتابوں ہی سے مخالفت کے لیے دلائل جمع کرتا رہو۔ رضوان.......... سنیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس موضوع پر کتاب لکھ رہا تھا۔"

"مجھ سے تو اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی اس کی۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ نیلم کو ایسا لگا' جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ یہ علامت وہ خوب پہچانتی تھی۔ اس کی صلاحیت اس سے پہلے کبھی اتنی کثرت سے نہیں ابھری تھی۔ شاید ایسا اسی لیے ہو رہا تھا کہ اب وہ پوری طرح ملوث ہو چکی تھی۔ بس خوف کی ایک تند لہر تھی' جس کا سبب وہ نہیں سمجھ سکی۔ پھر وہ لہریں معدوم ہوئیں' جیسے اس نے کبھی اس کے وجود کو چھوا ہی نہیں تھا۔ نیلما سمجھ گئی کہ اس کا تعلق رضوان کی اس بات سے ہے' جو وہ بتانا چاہ رہا ہے۔ اس کا تعلق اپنی کتاب کے سلسلے میں جاوید کی ریسرچ سے ہے۔

اس نے غور سے رضوان کو دیکھا۔ مگر اس نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ ”لیکن یہاں سے کسی کو کوئی مسودہ نہیں ملا۔“ وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسودے کا کیا ہوا۔ بلکہ مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ شاید وہ کچھ لکھ ہی نہیں رہا تھا۔“

”مسودہ تو اس نے جلا دیا تھا۔“ عقب سے کسی نے کہا۔ وہ دونوں چونکے۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ شہناز اُن کے روبرو تھی۔

”تم لوگ کس چکر میں ہو؟“ شہناز نے پوچھا۔ ”اور اوپری منزل پر کون ہے؟ رضوان، مجھے تم سے بات کرنا تھی۔ میں تمہارے گھر گئی۔ تمہاری ملازمہ نے بتایا کہ تم ریسٹورنٹ گئے ہو اور کھانا وہیں کھاؤ گے۔ میں واپس آ رہی تھی کہ مجھے یہاں روشنی نظر آئی۔ سو میں یہاں آ گئی۔ پولیس تمہاری یہاں موجودگی میں شدت سے دلچسپی لے سکتی ہے۔ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟“ اس کے لہجے میں واضح چیلنج تھا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جاؤ اور بے شک، پولیس کو بلا لاؤ۔“ رضوان نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم ہماری مدد بھی کر سکتی ہو۔ تم نے یہ بات کیوں کہی کہ جاوید نے اپنا مسودہ جلا ڈالا تھا۔“

شہناز بڑھی اور میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا لیے۔ پھر وہ بولی۔ ”اس نے مسودہ کیوں جلایا، یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں اس کی دوست تھی۔ بہت عرصے سے اسے جانتی تھی۔ ستارہ سے بھی پہلے سے......... ستارہ سے بھی زیادہ۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے وہ باتیں بھی کر لیتا تھا، جو کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس روز میں یہاں موجود تھی، جب اس نے اپنے لکھے ہوئے صفحات جمع کیے اور یقین کرو، اس نے بہت زیادہ نہیں لکھا تھا۔ بہرحال اس نے میرے سامنے وہ صفحات یکجا کر کے آتش دان میں ڈال دیے۔ میرا خیال ہے، وہ جو کچھ بھی لکھ رہا تھا، اس سے خوف زدہ تھا۔“

وقار اس قدر دبے پاؤں آیا تھا کہ کسی کو اس کی آمد کا پتا ہی نہ چلا۔ پھر رضوان اور نیلما کی نظر اس پر پڑی تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ دیا۔ وہ شہناز کی پشت پر کھڑا تھا۔

”تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ممکن ہے، بانو یہاں......... جاوید کے ہاں چھپی ہوئی ہو؟“ رضوان نے نیلما سے پوچھا۔

شہناز ایک لمحے کو ہچکچائی۔ ”کیوں......... تم نے ایسا کیوں سوچا؟“

”وقار کا کہنا ہے کہ اس نے بانو کو یہاں دیکھا ہے۔“

”وہ جاہل اور منتقم مزاج آدمی، میرے نزدیک اس سے کچھ بعید نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جاوید کے ٹب میں سانپ اسی نے رکھا ہو۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ہر شخص کو اس سے محتاط رہنا چاہیے، اس سے ڈرنا چاہیے۔“

شہناز کے لہجے میں بلا کی نفرت تھی۔ نیلما نے سوچا کہ اس سے حقیقت اگلوانے کے لیے صرف ایک ہلکی سی چٹکی کافی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ علم ہو کہ چٹکی کہاں سے بھری جائے۔

وقار اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ مگر نیلما نے اس کی آنکھوں میں تاریکی پھیلتے دیکھی۔ پھر وہ جتنی خاموشی سے آیا تھا، اتنی ہی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ شہناز کو نہ اس کی آمد کا پتا چلا تھا نہ اس کے واپس جانے کا۔

”جاوید ایک کتاب سے بالخصوص حوالے جمع کرتا تھا۔“ شہناز نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اب وہ کتاب جہاں رکھی ہوتی تھی، وہاں نظر نہیں آ رہی ہے۔ بلکہ وہ جگہ خالی ہے۔ وہ ایب نارمل سائیکالوجی پر بے حد ضخیم کتاب تھی۔ اس میں غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل خواتین کے بارے میں ایک باب تھا، جس میں وہ خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ ایک بار اس نے اس سلسلے میں کلثوم کے گھر جا کر اس سے بات کی تھی۔“

”کلثوم ہی کیوں؟“ رضوان نے پوچھا۔

”کلثوم جادو، ٹونے اور جادوگرنیوں کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے۔ ممکن ہے، کچھ نہ جانتی ہو مگر بولتی بہت ہے۔ اس کے سات بہن بھائی تھے۔ اس لیے وہ آپس کے جھگڑوں، رقابتوں اور محرومیوں سے خُوب واقف ہے۔ اس کا تجربہ بھی وسیع ہے۔ اس کی دو بہنیں ایک ہی شخص کی محبت میں گرفتار ہوئی تھیں۔ برسوں انھوں نے ایک دوسرے سے بات بھی نہ کی حالانکہ محروم دونوں ہی رہیں۔ ان کے محبوب کی شادی کسی اور ہی سے ہوئی جس روز جاوید، کلثوم سے اس کے خاندانی پس منظر پر گفتگو کرنے گیا، میں اس کے ساتھ تھی۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ اب اس بات کی کوئی اہمیت ہے۔“ رضوان نے کہا۔ ”ہم تو یہاں کوئی ایسی نشانی ڈھونڈنے آئے تھے، جس سے پتا چلتا ہو کہ بانو جاوید کی موت کے بعد بھی یہاں رہتی رہی ہے۔ وقار کہتا ہے، اس نے یہاں بانو کو دیکھا ہے۔ جبکہ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، جو کچھ بھی ہوا ہو، یہ یقین ہے کہ اگر بانو زندہ ہے تو

یہاں کبھی نہیں آئے گی۔"

"کچن میں ایک کٹا ہوا آلو رکھا ہے، جو پچھلی بار، جب میں یہاں آئی تو موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے، یہاں کوئی آتا رہا ہے۔" نیلما نے کہا۔

"چلو...... ہمیں پورا گھر دکھاؤ شہناز۔ تم اس گھر سے ہم سے زیادہ واقف ہو۔" رضوان نے شہناز سے کہا۔

"میں ستارہ سے ملنے اکثر یہاں آتی تھی۔" شہناز نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "مجھے وہ جگہ بھی معلوم ہے، جہاں ستارہ وہ چیزیں چھپاتی تھی، جو جاوید کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ جاوید، ستارہ کی بچوں والی کہانیوں سے بہت چڑتا تھا۔ وہ اسے گھٹیا کام تصور کرتا تھا۔ چنانچہ ستارہ چھپ چھپ کر لکھتی اور جاوید کے آنے سے پہلے اپنے مسودے چھپا دیتی تھی، یہ عجیب بات ہے کہ جانوروں والی کہانیوں کا مسودہ گھر میں نہیں ملا۔ کم از کم جاوید کو نہیں ملا۔ حالانکہ ستارہ نے مجھے وہ مسودہ دکھایا نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ اس پر بڑی تندہی سے کام کر رہی ہے۔"

"آپ ہمیں وہ جگہ دکھا دیں، جہاں وہ اپنے شوہر سے چھپا کر مسودے رکھتی تھیں۔" نیلما نے فرمائش کی۔

شہناز چند لمحے ہچکچائی۔ پھر بولی۔ "میرا خیال ہے، اب اس میں کوئی حرج نہیں۔ ایک دوچھتی ہے، جس میں پرانے ٹرنک اور بکس رکھے ہیں۔ جاوید کو گرد سے الرجی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی ضرورتاً بھی دوچھتی کا رخ نہیں کرتا تھا۔ ستارہ جاوید سے چھپانے والی ہر چیز اسی دوچھتی میں رکھتی تھی۔"

"ہمارے ساتھ اوپر چل کر ہمیں وہ جگہ دکھاؤ۔" رضوان نے شہناز سے کہا۔

"میں باز آئی۔ تم خود ہی دیکھ لو۔ میں تو گھر جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر شہناز تیزی سے باہر چلی گئی۔ چند لمحے بعد نیلما اور رضوان نے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔

"چلو، ہم خود ہی تلاش کرتے ہیں وہ جگہ۔" رضوان نے نیلما سے کہا۔ "اب کوئی اور جگہ بچی بھی نہیں۔" پھر اس نے وقار کو پکارا۔

وقار اوپری منزل پر جانے والے زینوں پر ان کا منتظر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی۔ ستارہ کے کمرے میں دوچھتی کے ساتھ اس نے لکڑی کی ایک سیڑھی لگا دی تھی۔ سب سے پہلے وقار اوپر چڑھا، پھر نیلما اور آخر میں رضوان۔

ٹارچ کی روشنی میں دوچھتی پر سائے ہی سائے لرزتے کانپتے نظر آ رہے تھے۔ فضا میں سیلن زدہ بُو رچی ہوئی تھی۔ دوچھتی کے افتادہ ترین گوشے میں اوپر تلے چند ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔ قریب جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ دیوار سے بالکل لگے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ان کے اور دیوار کے درمیان ایک خلا تھا، جو سامنے سے نظر نہیں آتا۔ ایک ٹرنک کے اوپر ایک ٹیبل لیمپ اور ایک الیکٹرک ہیٹر رکھا تھا۔ دوسرے ٹرنک پر ایک برقی پنکھا رکھا ہوا تھا۔

نیلما بکسوں کی سائیڈ سے گھوم کر عقب میں گئی۔ وہاں دو تکیے اور ایک کمبل تھا۔ اس کے علاوہ ایک لبادہ بھی تھا۔ بکسوں کے عقب میں اتنی کشادہ جگہ تھی کہ کوئی بڑے آرام سے وہاں سو سکتا تھا۔ دیوار سے ایک شکستہ آئینہ ٹکا دیا گیا تھا۔ کیلوں پر ہینگر لٹکے تھے۔ ہینگروں پر کچھ کپڑے تھے۔

رضوان بھی نیلما کے پیچھے چلا آیا۔ "یہ چیزیں بانو کی تو نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہو بھی نہیں سکتیں۔" دوسری طرف سے وقار بولا۔ "بانو نے گھر چھوڑتے وقت اپنے ساتھ کچھ لیا ہی نہیں تھا۔" پھر وہ بھی ٹرنکوں کے پیچھے چلا آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز اٹھائی اور بولا۔ "شاید اس کے سوا وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائی تھی۔"

نیلما اور رضوان نے چونک کر دیکھا۔ وقار کے ہاتھ میں ایک لبادہ تھا۔ وہ یقیناً وہی لبادہ تھا، جس میں کسی کو جنگل کے کنارے دیکھا گیا تھا۔ وہ اسی قسم کا لبادہ تھا، جیسا کسی نے نیلما کو شکار کرنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

'اب ایک سوال پھر شدت سے سر اٹھا رہا تھا۔ جنگل کے باہر جسے دیکھا گیا تھا، وہ بانو تھی یا کوئی اور؟ اس مکان میں جاوید کے ساتھ چھپ کر رہنے والی ہستی بانو تھی یا کوئی اور؟ اگر وہ بانو نہیں تھی تو اور کون ہو سکتا ہے؟

لیکن ہر اعتبار سے ثابت یہی ہوتا تھا کہ وہ بانو ہی ہو گی۔

☆======☆======☆

وہ جاوید کے مکان سے نکل آیا۔ رضوان بہت بجھا بجھا تھا بلکہ الجھا الجھا سا۔ یہ انکشاف کہ بانو زندہ بھی ہو سکتی ہے، اسے ہلا گیا تھا۔ اس سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ اگر وہ زندہ ہے تو سب سے چھپ کر جاوید کے گھر میں اس کے ساتھ رہتی رہی ہے بلکہ یہ امکان بھی سامنے آیا تھا کہ جاوید کی موت میں اس کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سن کر برداشت کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا۔

نیلما کو احساس تھا کہ رضوان پر کیا گزر رہی ہے لیکن وہ بے بس تھی۔ جانتی تھی کہ اس وقت اس سے لفظوں میں ہمدردی کرنا بھی اس کی اذیت میں اضافے کا سبب ہو گا۔ لفظ اسے سکون نہیں دے سکتے تھے۔

"میرے گھر چلو۔ چائے پئیں گے۔" وقار نے پیش کش کی۔

"رات ہو چکی ہے۔ چاہو تو میرے گھر ہی سو جانا۔ ممکن ہے' بانو رات کو پھر جاوید کے گھر آئے۔ صبح دیکھیں گے۔ شاید سامنا بھی ہو جائے۔"

بارش رک چکی تھی۔

"شکریہ وقار۔" رضوان نے کہا۔ "پہلے تو میں نیلما کو باجی کے گھر چھوڑ آؤں۔ پھر میں تمہارے پاس آؤں گا۔ عمران' عذرا کے ساتھ رہ لے گا۔ میں اس جگہ کے قریب رہنا چاہتا ہوں جہاں بانو کے آنے کا امکان ہو۔ ممکن ہے' مجھے اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل جائے۔"

وقار نے اپنے کیبن کے دروازے پر انہیں رخصت کیا۔ نیلما کو احساس ہو رہا تھا کہ وقار احساس جرم سے دوچار ہے۔ وہ یقینی طور پر متاسف تھا۔ اس نے شکوک کو ہوا دے کر رضوان کو دکھی کر دیا تھا۔ نیلما سوچتی رہی کہ سچ عام طور پر کتنا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ وقار کو دوسرا احساس جرم یہ بھی ہو گا کہ اگر وہ پہلے ہی اپنے شکوک ظاہر کر دیتا تو ممکن ہے' جاوید آج زندہ ہوتا' لیکن وقار کیا کرتا؟ ہر شخص اپنی فطرت' اپنے مزاج کا غلام ہونے کے ناتے مجبور ہوتا ہے۔ ہر انسان پیدائش کے لمحے سے حالات اور واقعات کی ایک طویل زنجیر سے بندھ جاتا ہے لیکن یہ مان لیا جائے تو پھر انسان کا اختیار ہی کہاں ثابت ہوتا ہے۔ وہی مسئلہ جبر و قدر۔

نیلما نے جھنجلا کر سر جھٹکا۔

"اختیار تو حاصل ہے انسان کو۔" رضوان نے یوں کہا جیسے اس کے خیالات پڑھ رہا ہو۔

"ہاں۔ یہ سچ ہے۔" نیلما نے کہا۔ "ایک بات بتاؤں۔ مما کا خیال ہے' جو کچھ ہوتا ہے' ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے کئی راستے ہوتے ہیں اور ہمیں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوتا ہے۔ مما کو بہترین راستہ منتخب کرنے کا ہنر آتا ہے لیکن میں الجھ جاتی ہوں۔" نیلما کو احساس ہوا کہ بات کہیں کی کہیں نکل گئی ہے۔

بالکل غیر متوقع طور پر رضوان نے اسٹیئرنگ وھیل سے ایک ہاتھ ہٹایا اور اس کے

ہاتھ پر رکھ دیا۔ "نہیں......... تم مجھ سے بہتر ہو نیلم۔ تم مجھ سے زیادہ نہیں الجھتیں اور تم مجھ سے بہتر فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتی ہو۔" اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ ماجی خالہ کے گھر کے سامنے جیپ سے اترتے ہوئے نیلم نے اس خاموشی کو توڑا۔ "مجھے بہت افسوس ہوا۔ جو کچھ ہوا......... آپ کو جو تکلیف پہنچی........." آگے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ جانتی تھی کہ لفظوں کی اہلیت کتنی کم ہے۔ وہ کتنے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔

رضوان نے سر کے اشارے سے سلام کیا اور جیپ آگے بڑھا لے گیا۔

ماجی خالہ ڈرائنگ روم میں چائے کی پیالی سامنے رکھے بیٹھی تھیں۔ نیلما کو خوف آنے لگا۔ جانتی تھی کہ اب سوالات کی وہ گولہ باری شروع ہو گی کہ جواب دینا دشوار ہو جائے گا لیکن ماجی خالہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "تمہاری مما کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں فوری طور پر بانو کے گھر جانا چاہیے۔"

"تو چلیں۔" نیلما نے مختصراً کہا۔ وہ جانتی تھی کہ مما نے کوئی ہدایت دی ہے تو بے سبب نہیں دی ہو گی۔

ماجی خالہ نے اپنی گاڑی نکالی۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ وہ رضوان کے گھر پہنچے۔ اوپری منزل کی تمام کھڑکیاں روشن تھیں۔ عذرا دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انداز میں ایسی بے یقینی تھی جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ کیا کرے۔

"آپ اوپر چلی جائیں۔" اس نے ان دونوں کو دیکھتے ہی کہا۔ "لیکن عمران کو جگانا نہ دیجئے گا۔"

نیلما اور ماجی خالہ اندر داخل ہوئیں۔ نیلما آگے آگے تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ اس کی صلاحیت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ بانو کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دیے بغیر نہایت آہستگی سے اسے دھکیلا۔ ماجی خالہ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔

اندر تمام لائٹیں روشن تھیں۔ وہ عورت اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ کپڑوں کی الماری کھلی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس نے سفید لباس الماری میں سے نکالا ہو گا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں!" وہ بولی۔ اس کے رخساروں پر بہنے

والے آنسو خشک ہو چکے تھے البتہ لکیریں باقی تھیں۔ وہ بے حد مایوس نظر آ رہی تھی۔

نیلما کا وجود انجانے دکھ سے بھر گیا۔ تو یہ ہے رضوان کی بیوی۔ اس نے خود ترسی کی کیفیت میں سوچا۔ مگر پھر اسے بانو پر اتنی شدت سے ترس آیا کہ وہ اپنا دکھ یکسر بھول گئی۔ وہ بدنصیب عورت جو گھر والی ہوتے ہوئے بے گھر ہو گئی تھی۔

اچانک نیلما کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر بانو کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "آپ اب محفوظ ہیں۔" اس نے کہا۔ "جو کچھ ہمیں بتانا چاہیں بتا سکتی ہیں۔ ہم سنیں گے اور آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔"

بانو اس کے لمس سے قدرے پُرسکون ہو گئی۔ نیلما نے اسے سہارا دیا تو اس نے اس کے بازو سے سر ٹکا دیا۔

نیلما اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔ وہ بہت پیاری........ بہت خوب صورت تھی۔ اس کا حسن غیر ارضی ہونے کا تاثر چھوڑتا تھا۔ اسکیچز میں اور ماجی خالہ کی پینٹنگ میں اسے جتنا نازک دکھایا گیا تھا' وہ اس سے زیادہ نازک تھی۔ اس کی بنفشی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ مگر اس وقت آنسوؤں نے ان کی سرخی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی کٹورا سی آنکھوں سے نیلما کو یوں تک رہی تھی جیسے اس کے چہرے سے توانائی اور اعتماد حاصل کر رہی ہو۔

نیلما سرگوشیوں میں تسلی دیتی رہی۔ پھر بانو نے بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مگر اب مجھے چلے جانا چاہیے۔"

"بیٹھ جاؤ بانو۔" ماجی خالہ نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کوئی کسی بات پر مجبور نہیں کرے گا لیکن بہتر یہی ہے کہ تم ہم سے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ میری بھانجی ہے........ نیلما۔"

"میں جانتی ہوں........ سب جانتی ہوں۔" بانو نے کہا۔ "لیکن اب مجھے جانا ہے۔ میرے لیے اس گھر میں رکنا ٹھیک نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی یہاں آ جائے۔"

"وہ؟ کون وہ؟"

بانو کی آنکھوں میں دہشت امنڈ آئی۔ ایسا لگا جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑنے والا

ہے۔ "اس بار میں بچ کر نکل آئی لیکن بالآخر وہ مجھے تلاش کر لے گی۔ وہ ہمیشہ مجھے ڈھونڈ نکالتی ہے۔"

"ہمیں بتاؤ تو' کس کی بات کر رہی ہو تم۔" ماجی خالہ نے تسلی دینے والے انداز میں پوچھا۔

لیکن اس کا لہجہ بھی بانو کو پُرسکون نہ کر سکا۔ "میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ ورنہ وہ مجھے سزا دے گی۔"

"اگر ہمیں علم ہو جائے کہ وہ کون ہے تو ہم اسے روک سکتے ہیں۔"

بانو نے اپنا لبادہ اٹھایا اور دروازے کی طرف بھاگی۔ نیلما اس کا راستہ روکنے کی غرض سے لپکی۔ "پلیز........ سنیے۔ رضواں اس وقت وقار کے گھر موجود ہیں۔ ہم انہیں بلا لیتے ہیں۔ یقین کیجیے' رضوان آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ وہ بھی آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ جو کچھ میں نے جاوید کے ساتھ کیا' اس کے بعد یہ ممکن نہیں۔ اب تک بہت کچھ ہو چکا ہے اور وہ کہتی ہے کہ سب قصور میرا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو بچانا بھی ہے اور اسے روکنا بھی ہے۔ بس مجھ میں جرأت کی کمی ہے۔ میں کبھی بہادر نہیں رہی۔"

"دیکھو بانو' سب سے پہلے تو تمہیں رضوان سے ملنا چاہیے۔" ماجی خالہ نے کہا۔ "میں ابھی اسے بلواتی ہوں۔ تمہاری مدد کرنا اس کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔"

"نہیں۔ اب میں رضوان کی رہی بھی کب ہوں۔ ہم دونوں نے تو بہت پہلے ایک دوسرے کو کھو دیا ہے۔" بانو نے کہا اور نیلما کو ایک طرف ہٹا کر ڈرامائی انداز میں اپنے ہاتھ بلند کیے۔ "میں تو جنگلوں اور پہاڑوں کی ہوں۔ میرا تعلق چاندنی سے' دھنک سے ہے۔ مجھے ان تمام چیزوں سے خوف نہیں آتا۔ میں وہیں جانا چاہتی ہوں۔ مجھے وہیں جانا چاہیے۔ وہ وہاں تک میرا پیچھا بھی نہیں کر سکے گی۔"

"بارش بہت تیز ہو رہی ہے۔ ایسے میں تم کہیں نہیں جا سکتیں۔"

"مجھے بارش کی پروا نہیں۔ یہ طوفان ہی میرے لیے باعث پناہ ہے۔ یہ مجھے اس کی نظروں سے چھپا سکتا ہے۔ میں نے یہاں آ کر بے وقوفی کی لیکن میں تو ہوں ہی ہمیشہ کی بے وقوف۔"

"بانو' تم اپنے بیٹے کے متعلق کیوں نہیں سوچتیں۔" ماجی خالہ نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "عمران بہت شدت سے تمہاری کمی محسوس کرتا ہے۔ اچھا۔ چلو' جانے سے پہلے

اسے کم از کم ایک نظر تو دیکھ لو۔"

بانو نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مہلت نہیں ہے۔ ویسے بھی آج اگر عمران مجھے نہ دیکھے تو اس کے حق میں یہی بہتر ہو گا۔"

نیلما بھی بانو کے پیچھے بھاگی۔ پھر اس کی نظر رضوان پر پڑی جو مرکزی دروازے پر تھا۔ اس نے بانو کو دیکھا تو اس کے قدم رک گئے۔ "وقار کے کیبن سے مجھے بانو کے کمرے میں روشنی نظر آئی۔ میں تحقیق کی غرض سے چلا آیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

بانو ایک لمحے کو ٹھٹکی اور رضوان کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ عقبی دروازے کی طرف بھاگی اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ رضوان بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ نیلما نے اسے عقبی دروازے کے قدمچے پھلانگتے دیکھا۔

نیلما' ماجی اور عذرا بھی عقبی دروازے پر پہنچیں لیکن وہیں رک گئیں۔ مکان کے عقبی حصے کے سامنے والے جنگل میں کسی قسم کی نقل و حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بارش کی آواز اور ہوا کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر انہوں نے اچانک ہی مکان کے سامنے کھڑی جیب اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ نیلما کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا۔ بانو گھوم کر مکان کے سامنے پہنچی تھی۔ جہاں جیپ اس کے لیے کسی نعمت کی طرح موجود تھی۔ وہ تینوں مرکزی دروازے کی طرح لپکیں۔ اسی لمحے انہوں نے رضوان کو چیخ کر بانو کا نام پکارتے سنا۔ مگر بانو نے جیپ پوری رفتار سے دوڑا دی تھی۔ پہاڑی راستے یوں ہی خطرناک ہوتے ہیں لیکن بارش کے دوران اور بارش کے بعد تو ذرا سی بے احتیاطی پر آدمی کو سزائے موت دے دیتے ہیں اور بانو نے جس رفتار پر جیپ چھوڑی تھی' وہ موت کے منہ میں جاتی معلوم ہو رہی تھی۔

پھر رضوان نمودار ہوا۔ ماجی خالہ نے اس سے کہا۔ "تم میری کار لے جاؤ۔ جاؤ۔ اسے بچا کر لے آؤ۔"

"بے کار ہے۔ میں اس تک پہنچ بھی گیا تو اسے فائدے کے بجائے نقصان ہی ہو گا۔ وہ اس علاقے سے باہر نہیں جائے گی۔ ایسا لگتا ہے' جیسے کسی آسیب نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ وہ یہیں رہنے پر مجبور ہے۔ میں یہ سب کچھ محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ آپ بتائیں' اس سے کیا گفتگو ہوئی؟"

"وہ کسی عورت کا تذکرہ کر رہی تھی جس نے نہ جانے کس انداز میں اسے قید کر

رکھا ہے لیکن اس نے اس عورت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ عورت اس علاقے کی نہیں' نہ ہی ہم اسے جانتے ہیں۔" نیلما نے بتایا۔ مگر اچانک ہی اسے اپنے وجود میں خوف کی تند لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ "مجھے بانو کو تلاش کرنا ہو گا۔" اس نے بلا ارادہ کہا۔

"کیسے تلاش کرو گی۔ جنگل بہت بڑا ہے۔ یہ علاقہ بہت وسیع ہے۔"

نیلما نے کوئی جواب دینے کے بجائے بانو کا وہ لبادہ اٹھا لیا' جو رضوان کو دیکھتے ہی بانو کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اس لبادے پر بانو کا لمس موجود تھا اور اس لمس کی مہک بھی۔ نیلما نے اسے ہاتھوں میں تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے لمحے گرد و پیش کا ہر احساس مٹ گیا۔ نیلما کے ذہن کے پردے پر ایک تصویر ابھر آئی۔ دھند تیزی سے اتر رہی تھی لیکن وہ بانو کو دیکھ سکتی تھی۔ بانو کسی کی منتظر کھڑی تھی۔ پھر دھند کچھ چھٹی تو نیلما کو جگہ کے متعلق بھی اندازہ ہوا۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ بانو کو بہت بڑا' خوف ناک خطرہ لاحق ہے۔

پھر اس کے وجود میں اپنی قوت کے ادراک کے ساتھ ہی اعتماد کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ جان گئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا' بہت تیزی سے کرنا تھا۔ ذرا سی تاخیر بھی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔ ماجی خالہ نے اسے پکارا لیکن وہ نہیں پلٹی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر بھاگی۔

وہ جگہ ایسی تھی' جہاں وہ صرف پیدل ہی پہنچ سکتی تھی۔ اس کے جسم میں توانائی موج در موج بہہ رہی تھی۔ وہ بغیر رکے بھاگتی رہی۔ پھر وہ کھلے آسمان اور بلند و بالا پہاڑوں سے منہ موڑ کر تاریک جنگل میں داخل ہو گئی۔

آگے راستہ دھندلا تھا۔ دھند اتر رہی تھی........ حقیقی دھند۔ راستے کے اطراف میں بلند و بالا درخت دیواروں کی طرح ایستادہ تھے۔ جہاں وہ کچھ فاصلے پر تھے' وہاں انہیں دیکھ کر ستونوں کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ نیلما کو احساس ہو رہا تھا کہ یہاں وہ پہلے بھی آ چکی ہے۔

دھند کی وجہ سے اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔ وہ اندھا دھند کسی چٹان سے یا کسی گرے ہوئے درخت سے ٹکرانا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ خواب اور موجودہ صورت حال میں صرف ایک فرق ہے۔ یہاں اسے عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک درختوں کی قطار معدوم ہو گئی اور اس نے خود کو اس چٹانی چھجے پر موجود پایا‘ جس پر سے گرنا ستارہ جاوید کی موت کا باعث بنا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی ہے۔ بانو چھجے کے کنارے پر کھڑی تھی۔ وہ یوں ساکت تھی‘ جیسے کسی کی آمد کی منتظر ہو اور اسے یقین ہو کہ کوئی ضرور آئے گا۔

نیلما نے آگے بڑھ کر اس کے نازک بدن کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اسے پیچھے کی طرف کھینچا۔ بانو کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے بسی سے رونے لگی۔ نیلما اسے بازوؤں میں لیے کھڑی رہی۔

"مجھے چھوڑ دو۔" بانو نے سرگوشی کی۔ "میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔ صرف اسی پر میں آزادانہ چل سکتی ہوں۔"

"نہیں۔ راستے تو اور بھی ہیں۔ رضوان تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" نیلما نے کہا۔

بانو نے اداس نظروں سے دیکھا۔ "رضوان کو تو خوشیاں ملنی چاہئیں۔ وہ ان کا مستحق ہے۔ میرے ساتھ اسے خوشیاں نہیں مل سکتیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس آجائے‘ مجھے چھوڑ دو۔"

"تم اپنی بہن کی بات کر رہی ہو نا؟" نیلما نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "مجھے اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ۔"

"وقت نہیں میرے پاس۔ مجھے معلوم ہے وہ آ رہی ہے۔"

بانو نے کہا اور خود کو نیلما کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ وہ خود کو چھجے کی کگر تک لے جانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ نیلما پوری قوت سے اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ بانو میں کوئی خوف ناک تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ بانو کی شخصیت بدل رہی ہے۔ خدوخال تبدیلی کے نام پر مسخ ہو رہے تھے۔ نرمی سختی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نفرت اتر آئی تھی۔ اس کی مزاحمت میں پہلے نزاکت تھی‘ مگر اب بے پناہ قوت آگئی تھی۔ نیلما اس عورت پر قابو نہیں پا سکتی تھی‘ جس نے بانو کی جگہ لے لی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ بس یہ ثابت ہو گیا تھا کہ بانو کے نرم و نازک جسم میں دو عورتیں تھیں اور دوسری عورت بے حد طاقت ور تھی۔

اب صورت حال برعکس تھی۔ اب نیلما کو چٹانی چھجے کی طرف گھسیٹا جا رہا تھا اور وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چند ہی لمحوں کے بعد اسے چھجے سے

دھکیل دیا جائے گا‘ جہاں موت اس کی منتظر تھی لیکن اسی وقت عجیب بات ہوئی۔ خواب پورے کا پورا سچ ثابت ہو گیا۔ اسے عقب کی سمت سے قدموں کی دھمک سنائی دی یعنی کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

درختوں سے گھرے ہوئے راستے کے اختتام پر رضوان نمودار ہوا تو نیلما کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے بانو کی گرفت سے اسے آزاد کرا کے اپنی طرف کھینچا۔ اب نیلما اس کی بانہوں میں تھی۔ وہ دونوں بانو کو گھور رہے تھے‘ جس کی شخصیت پھر بدل رہی تھی۔ اب وہ پھر نرم و نازک بانو تھی‘ جو صرف محبت کرنا جانتی تھی‘ جو کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں فاتحانہ مسرت کی جھلک تھی۔

"دیکھو۔" وہ خوشی سے چلائی اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

نیلما اور رضوان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش رک چکی تھی۔ درختوں اور چٹانوں پر سات رنگ کی کمان........ دھنک لہرا رہی تھی........ اور دھنک دھند کو چیر کر نکلی تھی۔ اس کے رنگ اتنے چمکیلے اور روشن تھے کہ لگتا تھا‘ کبھی معدوم نہیں ہوں گے۔ ہلکے بھی نہیں ہوں گے۔

بانو کو دیکھ کر لگتا تھا‘ جیسے وہ اس کمان کو اپنی کھلی بانہوں میں بھر رہی ہے۔ سینے سے لگا رہی ہے۔ "اس کا مطلب سمجھتے ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "سبز رنگ شفا کے لیے ہے‘ گلابی رنگ مسرتوں کے لیے‘ نیلا امن اور سکون کے لیے........" یہ کہتے کہتے اس نے محبت بھری نظروں سے رضوان کو دیکھا اور خلا میں پاؤں رکھ دیے‘ جیسے وہاں بھی اس کے قدموں کے نیچے کوئی دھنک ہو۔

نیلما اور رضوان سحر زدہ سے اپنی جگہ جمے کھڑے رہے۔ بانو کو دھند نے نگل لیا۔ پھر وہ آگے بڑھی اور انہوں نے نیچے دیکھا۔ ہلکی ہلکی ہوا دھند کو ہٹا رہی تھی۔ نیچے زمین پر بانو کا بے حس و حرکت جسم پڑا تھا۔

نیلما کے دل میں شک و شبہے سے پاک ایک یقین ابھرا کہ بانو محفوظ ہے........ ہر اعتبار سے محفوظ‘ پُرسکون۔ بہت نرمی سے رضوان نے نیلما کو اپنی گرفت سے آزاد کیا۔ پھر ان دونوں کو نیچے وادی میں ایک عورت کھڑی مسکراتی نظر آئی۔

"میں نے جلد از جلد آنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے‘ تم خیریت سے ہو۔ نیلی بیٹا‘ تمہیں میری مدد کی ضرورت تھی؟" شبنم نے

نیچے سے پوچھا۔ اس کی مسکراہٹ اور واضح ہو گئی۔

"میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی مما۔" نیلما نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

رضوان اور نیلما نیچے اتر کر شبنم کے پاس پہنچے تو نیلما نے پھر کہا۔ "میں بانو کی مدد نہیں کر سکتی تھی مما۔ اس نے خود دھنک کو چھوڑ کر دھند کو چن لیا۔"

شبنم نے اداسی سے سر ہلایا۔ "اس کے راز وہی جانے۔ ایسا لگتا ہے کہ کبھی کبھی ایک جسم میں دو روحیں پیدا ہوتی ہیں' جو ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہیں کہ پوری زندگی ایک دوسرے سے لڑنے میں گزار دیتی ہیں۔ بانو نے اپنے انداز میں شر سے آزادی حاصل کر لی۔ خدا کا شکر ہے اور رضوان' میں تمہاری بھی شکر گزار ہوں کہ تم میری بیٹی کو بچانے بروقت یہاں پہنچ گئے۔"

رضوان نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ بانو ایک نہیں' دو ہے' لیکن میں سمجھ نہیں پاتا تھا پوری طرح۔ اس میں وفا بھی تھی اور بے وفائی بھی۔ سچائی بھی تھی اور فریب بھی۔ میں عمر بھر دھوکا کھاتا رہا۔ سمجھ جاتا تو اسے بچا سکتا تھا۔"

"خود کو الزام نہ دو۔" شبنم نے کہا' پھر پوچھا۔ "تم یہاں تک پہنچے کیسے؟ کس چیز نے رہنمائی کی تمہاری؟"

رضوان نے نیلما کا ہاتھ یوں مضبوطی سے تھاما' جیسے ساری زندگی کے لیے تھاما ہو۔

"مجھے معلوم تھا کہ مجھے نیلما کو تلاش کرنا ہے......... فوری طور پر' اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خطرے میں ہے اور اس جگہ کا بھی مجھے علم تھا۔ میں وقار کا شکر گزار ہوں' جس نے اپنی بات مجھ سے منوا کے چھوڑی۔ وہ کہتا تھا' مجھ میں صلاحیت ہے۔ آج جب نیلما کے لیے پریشان ہو کر میں نے اپنے اندر جھانکا تو مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا۔"

"تم بروقت آئے میری نیلی کو بچانے۔" شبنم نے کہا۔ پھر بولی۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ مجھے پولیس کو مطلع کرنا ہے۔"

رضوان نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

شبنم کے جانے کے بعد رضوان نے نیلما کی طرف دیکھا' جو دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "تم اس جلد بازی پر ممکن ہے' مجھے مطعون کرو لیکن نیلم' میں نے پچھلے عرصے جو اذیت اٹھائی ہے' اس کے بعد میں انتظار نہیں کر سکتا۔ میں لفظوں کا آدمی بھی نہیں کہ خوب صورت فقروں سے تمہید باندھوں۔ میں سیدھی سی بات کروں گا۔ کیا تم میرا اور عمران کا ساتھ دے سکتی ہو؟"

نیلما نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پھر آسمان پر کھلے ہوئے دھنک کے پھول کو۔ دونوں بانوئیں بھی آزاد ہو چکی ہیں......... اس نے سوچا......... اور رضوان بھی۔ اب کوئی ڈر نہیں۔ دل کی بات کہنے میں حرج ہی کیا ہے۔ سو اس نے نگاہیں اٹھائیں اور ان کی زبانی حدیثِ دل شروع کر دی۔

☆=======ختم شد======☆